وما ارسلنٰک الا رحمۃ للعالمین
سیرتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم
سیرتِ رسول کا حسین و جمیل مرقّع
ڈاکٹر صاحبزادہ
ساجد الرحمٰن
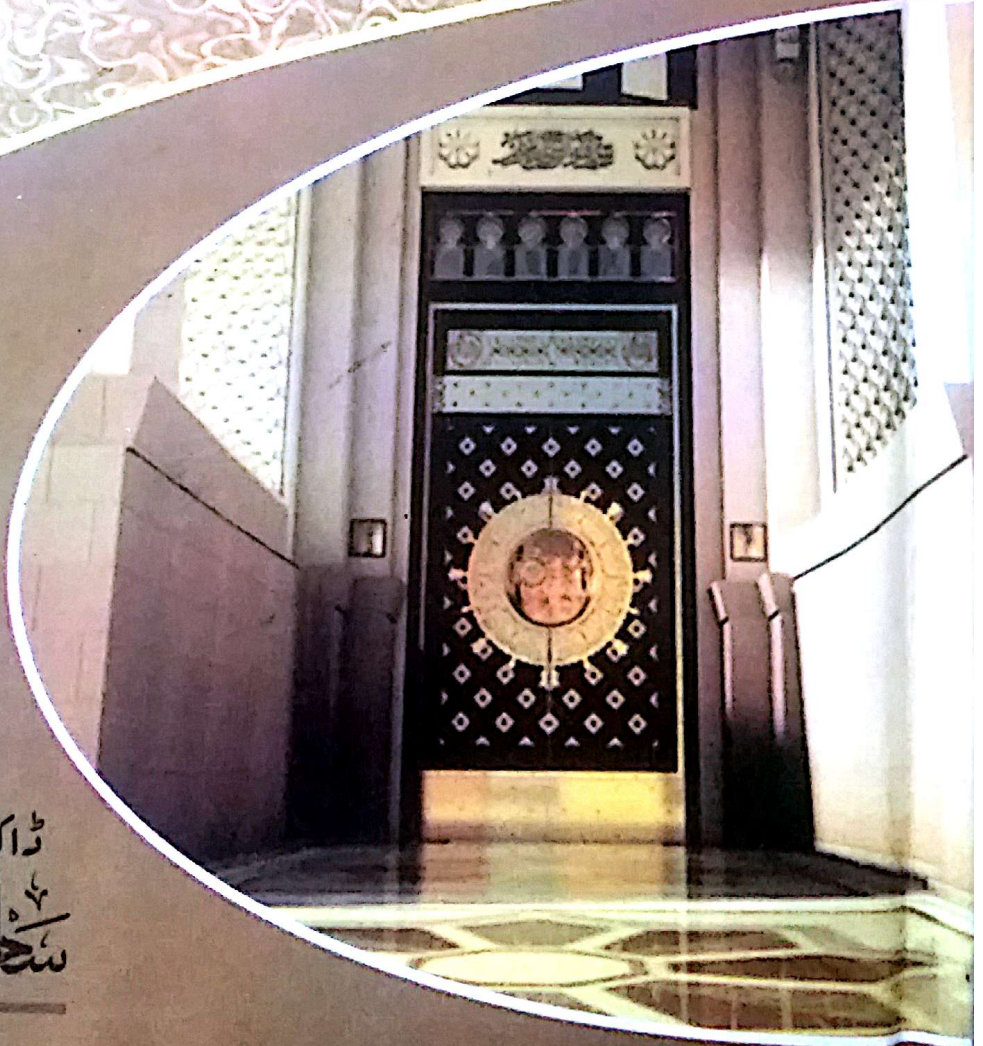
سیرتِ رسول ﷺ

سیرتِ رسول ﷺ کا حسین و جمیل مُرقّع

تالیف

ڈاکٹر صاحبزادہ ساجد الرحمٰن

دعوۃ اکیڈمی

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد

نام کتاب	:	سیرتِ رسول ﷺ
تالیف	:	ڈاکٹر صاحبزادہ ساجد الرحمٰن
نگران طباعت	:	ناصر فرید
کمپوزنگ	:	محمد اعظم
سرورق	:	محمد طارق اعظم
حروف خوانی	:	محمد اشتیاق خاکی
طابع	:	ادارہ تحقیقات اسلامی پریس، اسلام آباد
اشاعت اوّل	:	۱۹۸۲ء
اشاعت دوم	:	۲۰۱۳ء
تعداد اشاعت	:	۱۰۰۰
قیمت	:	۳۵۰ روپے

ISBN. 978-969-556-287-1

ناشر

دعوۃ اکیڈمی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد

نذر بحضور

حاصلِ کونین

ﷺ

آب و گِل میں مدتوں آرائشیں ہوتی رہیں
تب کہیں ایک آدمی کونین کا حاصل بنا

احسان دانش

لَا یُمکِنُ الثَّناءُ کَمَا کَانَ حَقّہٗ

بَعد از خدا بزرگ تُوئی قِصّہ مختصر

فہرست

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیش لفظ

کائنات کی وسعتیں بے کراں ہیں۔ سائنس دانوں کی دُور رَس نگاہوں نے بے شمار نئے نظام ہائے شمسی کا سراغ لگایا ہے۔ یہ وُسعتیں اوران میں تنوع اپنے خواص، اثرات، رنگ و بو اور کیف و کم کے اعتبار سے ہوشربا ہیں۔ کہیں ثریا کی بلندیاں ہیں اور کہیں ثریٰ کی پستیاں، کہیں عرش کی عظمتیں اور کہیں فرش کی خاکساریاں، کہیں نور کی جلوہ سامانیاں ہیں اور کہیں خاک کی تیرگیاں۔ زندگی کے ان گنت جلوے ہیں۔ ہر جلوہ نظر افروز بھی ہے اور دِل ربا بھی لیکن آدم خاکی کی شان نرالی ہے۔ یہ خالق کائنات کے کمال کا شاہکار ہے۔ یہ اس عالَم میں اس کا خلیفہ ہے۔ اس کے ظاہری اور باطنی حسن و جمال اور فضل و کمال کی پردہ کشائی ان کلمات سے کی گئی ہے:

لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِيْٓ أَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ۝[1]

یقیناً ہم نے انسان کو بہترین صورت میں پیدا کیا۔

اس میں مضمر صلاحیتوں سے اور خُفتہ قوتوں کے گنج ہائے گراں مایہ کو یہ فرما کر آشکارا کیا گیا ہے:

---

[1] التین ۹۵:۴

الَّذِیۡ خَلَقَکَ فَسَوّٰىکَ فَعَدَلَکَ ۝[2]

اللہ تعالیٰ وہ ہے جس نے (اے انسان) تجھے پیدا کیا، پھر تجھے درست کیا، پھر ذہنی اور جسمانی استعدادوں سے تجھے سنوارا۔

انسان دیکھنے میں تو کمزور ہے۔ ہاتھی کی طرح گرانڈیل بھی نہیں، شیر کی طرح طاقتور بھی نہیں، ہرن کی طرح تیز رفتار بھی نہیں، لیکن ہر چیز اس سے ہراساں ہے۔ پہاڑوں کی چوٹیاں اس کے قدمِ عزم کے سامنے سرنگوں ہیں۔ صحراؤں کی پنہائیاں اس کے حکم سے سکڑ جاتی ہیں۔ اس کے اشارے سے سمندروں کے سینے شق ہیں، کرۂ ہوا میں ابھرنے والی لہریں اس کے فرامین کو زمین کے ایک گوشہ سے دوسرے گوشہ تک پہنچانے میں مصروف ہیں۔

اس کے خالق نے اس کی تخلیق کا ذکر بھی بالکل نرالے انداز میں کیا ہے۔ ارض و سماء، مہر و ماہ، جن و ملک، شجر و حجر کی تخلیق کے بارے میں تو فرمایا:

اِنَّمَاۤ اَمۡرُہٗۤ اِذَاۤ اَرَادَ شَیۡئًا اَنۡ یَّقُوۡلَ لَہٗ کُنۡ فَیَکُوۡنُ ۝[3]

لیکن حضرتِ انسان کی آفرینش کا ذکر کیا تو فرمایا: خَلَقۡتُہٗ بِیَدِیۡ، میں نے اسے اپنی قدرت کے دو ہاتھوں سے پیدا کیا ہے۔ بلاشبہ اس کی پیدائش کو یہ خصوصی امتیاز حاصل ہے کہ اس کی روح اور عزم و حوصلہ کی جولانیوں کا اندازہ لگانا آسان نہیں۔ یہ خام صلاحیتیں عروسِ گیتی کی زلفیں سنوارنے کے کام بھی آسکتی ہیں اور اس کے قبائے شرف و کرامت کو تار تار بھی کر سکتی ہیں۔ یہ بادِ صرصر بن کر نیکی اور اصلاح کے روشن چراغوں کو گل بھی کر سکتی ہیں۔ جب تک ان کی صحیح نشو و نما نہیں ہو گی، ان کو صحیح خطوط پر چلانے کا اہتمام نہیں

2 الانفطار ۸۲: ۷

3 یٰس ۳۶: ۸۲

کیا جائے گا تو احسن تقویم کی بلندیوں پر دمکنے والا یہ مہ پارہ اسفل السافلین کی پستیوں میں ہمیشہ کے لیے ڈوب جائے گا۔ اس کی بے پناہ صلاحیتوں کا رخ حق اور خیر کی طرف موڑ دینا، اس کے دل میں برائی سے نفرت اور نیکی سے محبت پیدا کر دینا نازک مرحلہ اور نہایت مشکل کام ہے۔ اس کی مشکل کو آسان کرنے کے لیے، اس خطرناک موڑ سے کاروانِ انسانیت کو سلامت گزارنے کے لیے اللہ تعالیٰ انبیاء کرام کو مبعوث کرتا رہا ہے۔ اسی مقصدِ جلیل کی تکمیل کے لیے سیّد الانبیاء والمرسلین ﷺ کی تشریف آوری ہوئی۔

وہ سیّد الانبیاء والمرسلین ﷺ جن کے باعث گلشنِ حکمت و دانش میں بہار آئی، جن کی برکت سے انسان کا بختِ خُفتہ بیدار ہوا، جن کی مسیحائی نے عمل و خلق کو نئے عنوان عطا کیے، جن کی تربیت سے فقیروں کو قناعت واستغناء اور امیروں کو ذوقِ جود و عطا ملا، درویشوں کو خودداری اور شاہوں کو تواضع وانکساری نصیب ہوئی، جس نے علم کے رُخ سے شک اور ظن کی گرد کو صاف کیا، اسے نورِ یقین سے نکھارا اور عملِ صالح سے ہم کنار کیا، جن کے قدمِ ناز کی ٹھوکر سے خود غرضی، نفس پرستی، قومی عصبیت اور وطن پرستی کے سارے بُت (جن کے سامنے انسان صدیوں سے سجدہ ریز چلا آرہا تھا)، پاش پاش ہو گئے۔ اسی سیّد الانبیاء والمرسلین کی حیاتِ طیبہ کا مطالعہ ہمارے لیے سامانِ نجات اور روشنیٔ حیات ہے۔

کس قدر خوش نصیب ہیں وہ اہلِ قلم جو اس خیرُ البشر، فخر موجودات ﷺ کے اسوۂ حسنہ کو لوگوں کے سامنے پیش کرتے ہیں تاکہ اسے اپنے لیے مشعلِ راہ بنائیں۔

میرے نوجوان اور فاضل دوست محترم صاحبزادہ ساجد الرحمٰن صاحب ان ہی خوش نصیب حضرات میں شامل ہیں، جن کے حصے میں نبی کریم رؤف و رحیم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی سیرت نگاری کی سعادت آئی ہے۔

این سعادت بزورِ بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

پیشِ نظر "سیرتِ رسول ﷺ" صاحبزادہ صاحب نے نہایت محنت اور محبت سے مرتب فرمائی ہے۔ زبان و بیان صاف و شگفتہ اور اندازِ تحریر نہایت آسان اور دل نشین ہے۔ مناسب مقامات پر ضروری حوالے درج ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ ان کی یہ تالیف بہت ہی مفید ثابت ہو گی اور عوام و خواص سب اس سے پوری طرح مستفیض ہوں گے۔

میری دِلی دعا ہے کہ صاحبزادہ صاحب کی یہ کوشش مقبول ہو اور دارین میں اُن کے لیے سعادتوں کا باعث بنے! آمین بجاہ طٰہٰ و یٰسین۔

۱۹ ذی قعد ۱۴۰۴ھ / ۱۹۸۴ء

جسٹس پیر محمد کرم شاہ ازہری

سپریم کورٹ آف پاکستان، اسلام آباد

مقدمہ

بارگاہ رسالت مآب ﷺ میں نذرانۂ عقیدت پیش کرنے والوں کی فہرست اس قدر طویل ہے کہ اس کا احاطہ ممکن نہیں۔ یہ نثر کی صورت میں بھی اور نظم کی بھی۔ ہر زبان میں سیرت طیبہ کی ضخیم کتابیں موجود ہیں۔ اس کے باوصف مجھ ناچیز کو اس موضوع پر قلم اٹھانے کی جرأت کیوں کر ہوئی؟ حاشا و کلّا سیرتِ رسول ﷺ کے مصنفوں نے کوئی تشنگی باقی نہیں رکھی جس کی تلافی میرے پیشِ نظر ہے۔ مجھے محض اس جذبے نے یہ ہمت بخشی کہ سیرت نگاروں کی خوشہ چینی کر کے ایک گلدستۂ عقیدت بارگاہِ رسالت مآب ﷺ میں پیش کروں، مبادا کوئی جملہ نظر کرم کا موجب بن جائے اور میری دنیا و عقبیٰ دونوں سنور جائیں۔ حضور سرور عالم ﷺ کے سیرت نگاروں کی صف میں شمولیت سے بڑھ کر میرے لیے کوئی اعزاز و اکرام نہیں اور یہ تو وہ اعزاز ہے جس پر مسلمان تو مسلمان، غیر مسلم بھی نازاں و فرحاں ہیں۔ بیسویں صدی کی ابتدا میں جب آکسفورڈ یونیورسٹی کے مشہور پروفیسر مار گولیتھ نے "محمد اور ظہور اسلام" کے نام سے آنحضرت ﷺ کے حالات پر ایک کتاب انگریزی زبان میں لکھی تو اس کا آغاز ان الفاظ سے کیا، "حضرت محمد (ﷺ) کے سیرت نگاروں کا ایک طویل سلسلہ ہے جس کو ختم کرنا ناممکن ہے لیکن اس میں جگہ پانا باعث شرف ہے"[4]۔ اس حقیقت کے باوجود کہ آنحضرت ﷺ کی سیرتِ طیبہ پر دنیا کی مختلف

---

[4] Muhammad and th rise of Islam. piii London 1905

زبانوں میں جتنا لکھا گیا اس کا احاطہ ممکن ہی نہیں، یہ اعتراف بھی کرنا پڑتا ہے کہ قرآن مجید کے لامتناہی علوم و معارف کی طرح سیرتِ مصطفیٰ ﷺ بھی وہ مخزنِ علم و عرفان ہے، جو ہر دور کے لیے روشنی، ہر مسئلے کا حل اور ہر سوال کا جواب اپنے اندر رکھتی ہے۔ اس لیے یہ دعویٰ ناممکن ہو گا کہ فلاں کتاب سیرتِ طیبہ پر حرفِ آخر کی حیثیت رکھتی ہے۔

پھر بقول مولانا ابو الکلام آزاد "سخت ضرورت ہے ایسے مختصر رسائل وکتب کی جن میں مباحث و مناظرات متعلقِ سیرت سے بکلی چشم پوشی کی جائے، صرف حالاتِ زندگی صحت و تحقیق کے بعد درج کیے جائیں۔ اختصار ہر جگہ ملحوظ رہے، اور صرف وہی مواقع مفصل ہوں جن کی تفصیل ہماری موجودہ عملی زندگی کے لیے اسوۂ حسنہ کی دعوت رکھتی ہے اور جس کی نسبت الہامی فکرِ نقاد کے ساتھ کہا گیا تھا کہ "خلقہ القرآن" (آنحضرت ﷺ کا خلق، تعلیمِ قرآن کی تصویر ہے) ان رسائل سے عام مطالعہ وواقفیت اور اثر واصلاح کے علاوہ مخصوص طور پر مقصود یہ ہے کہ مجالسِ ذکرِ ولادتِ نبویؐ کی اصلاح ہو اور یہ جو ایک نہایت قومی رسمِ احتفال و اجتماع موجود ہے، اس کی قوت سے اصلی و حقیقت فائدہ اٹھایا جاسکے"[5]۔

ہر چند کہ خدائے بزرگ و برتر کے آخری نبی جنابِ محمد رسول اللہ ﷺ کی سیرت طیبہ کا کوئی گوشہ مخفی نہیں، آپ کی زندگی کا ہر ہر لمحہ امت کی رہنمائی کے لیے کتبِ سِیَر واحادیث میں محفوظ ہے۔ شعبہ ہائے حیات میں سے کسی بھی شعبے سے تعلق رکھنے والا انسان آپ کی حیاتِ مقدسہ سے رہنمائی حاصل کر سکتا ہے۔ خاتم النبیّن ہونے کے باعث آپ قیامت تک کی نسلِ انسانی کے لیے منبع ہدایت اور مینارۂ نور کی حیثیت رکھتے ہیں، آپ کی

---

5 رسولِ رحمتؐ، ابو الکلام آزاد ص ۲۵

ذات معیارِ حق اور منشاءِ ایزدی کی ترجمان ہے اور بلاشبہ ہم وہ خوش قسمت اُمت ہیں کہ جسے کسی دوسرے کی دریوزہ گری کی ضرورت نہیں۔ کاش ہم سُود وزیاں کا اندازہ کرپاتے، ہم پھر سے سوئے حرم گامزن ہوتے، فلسفہ ہائے مشرق ومغرب سے چھٹکارا حاصل کرکے گنبدِ خضراء کے مکین ﷺ کی حقیقی وابدی تعلیمات پر عمل پیرا ہوتے۔

بھٹکے ہوئے آہو کو پھر سُوئے حرم لے چل
اس شہر کے خوگر کو پھر وسعتِ صحرا دے
(اقبالؒ)

آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے: مَنْ لَمْ يَشْكُرِ النَّاسَ لَمْ يَشْكُرِ اللّٰه جو انسان کا شکریہ ادا نہیں کرتا وہ خدا کا شکر ادا نہیں کرپائے گا۔ اس کتاب کی ترتیب وتدوین اور اصلاحِ عبارت وغیرہ کے سلسلے میں جس شفقت ومہربانی سے میرے رفیق محترم جناب مولانا محمد میاں صدیقی نے رہنمائی فرمائی ہے، اس کے لیے دل کی گہرائیوں سے ان کا ممنونِ احسان ہوں۔ کتاب کی ترتیب وتسوید کے سلسلے میں ان سے بہت قریبی تعلق رہا ہے، ان کے علم وتحقیق کے متعلق میری رائے کی کیا وقعت ہوسکتی ہے۔ موصوف متعدد کتابوں کے مصنف اور مترجم ہیں اور اہلِ علم ان کی علمی وجاہت سے بخوبی آشنا ہیں۔ مجھے جو چیز عرض کرنا مقصود ہے، وہ موصوف کی تواضع، شفقت اور خلوص ہے، ہر طالب علم کی رہنمائی ان کی طبیعت کا خاصہ ہے۔ جَزَاهُمُ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْجَزَاء

آخر میں بارگاہِ رب العزت میں ملتجی ہوں، مولائے کریم میری اس کوشش کو

مقبول فرمائے اور حبِّ رسول و اطاعتِ رسول ﷺ کی لازوال دولت سے بہرہ مند فرمائے۔ آمین ثم آمین

در دلِ مسلم مقامِ مصطفیٰؐ است
آبروئے ما زنامِ مصطفیٰؐ است

ڈاکٹر صاحبزادہ ساجد الرحمٰن
ڈائریکٹر جنرل، دعوۃ اکیڈمی

التماس

سیّد الرسل خاتم الانبیاء حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ مقدسہ وہ مینارۂ نور ہے جس کی روشنی میں ہر زمانے کا متلاشیٔ حق راہِ مستقیم پر گامزن ہو سکتا ہے، اسی لیے خالقِ کائنات نے اِس ذاتِ اقدس سے محبت اوراس کی اطاعت کو ہی دنیوی واُخروی کامیابی کا معیار قرار دیا ہے۔

اِس ذاتِ اقدس سے محبت وعقیدت کے جو شواہد چشمِ فلک پیر نے دیکھے وہ کسی اور ہستی کو نصیب نہیں، پندرہ سو سال گزر چکے ہیں مگر آج بھی غلامانِ رسالت مآب ﷺ اپنے آقا کے قدومِ میمنت لزوم پر سب کچھ نثار کر دینے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ اس لازوال محبت میں شکوک وشبہات پیدا کرنے کے لیے ہر دور میں ہر مذموم حربہ استعمال کیا گیا، مگر ہر مرتبہ محبت کی آگ مزید بھڑکی اور دُنیا والوں کو پیغام دیا کہ یہ محبت اَزلی وابدی ہے، اس میں کبھی زوال نہیں آئے گا۔

حضور ﷺ کی سیرتِ طیّبہ کے ہر پہلو پر اتنا لکھا گیا کہ یہ اعزاز بھی کسی دوسرے کو حاصل نہیں۔ شعر ہو یا نظم، انداز تحقیقی ہو یا دعوتی، ہر زاویے سے لکھنے والوں نے اپنا دِل ودماغ سوغاتِ عقیدت کی صورت میں بارگاہِ رسالت مآب ﷺ میں پیش کر دیا۔

جب میں نے ادارہ تحقیقاتِ اسلامی میں اپنی ملازمت کا آغاز کیا تو ارادہ کیا کہ اپنے علمی سفر کا آغاز آپ ﷺ کی سیرتِ طیّبہ سے کر کے خوش نصیب سیرت نگاروں کی صف میں شامل ہو جاؤں۔ چنانچہ ۱۹۸۲ء میں میری یہ اوّلین تالیف، سیرتِ رسول ﷺ طبع ہوئی

اوراس کی طباعت کی سعادت اسلامک بک فاؤنڈیشن لاہور کو حاصل ہوئی۔

اس کی بارِ دگر اشاعت دعوۃ اکیڈمی کے زیرِ اہتمام ہو رہی ہے۔ میں ممنونِ کرم ہوں عزیزِ محترم ڈاکٹر محمد شاہد رفیع صاحب، انچارج شعبۂ تحقیق کا کہ انہوں نے مسوّدہ پر نظرِ ثانی فرمائی اور مناسب ترمیم واضافہ فرمایا۔ مجھ پر اپنے عزیزِ گرامی ناصر فرید صاحب، ڈپٹی ڈائریکٹر شعبۂ مطبوعات کا بھی شکریہ واجب ہے کہ اُنہوں نے خصوصی دل چسپی لے کر طباعت کا اہتمام کیا۔ اللہ جل شانہٗ ہم سب کی کوششوں کو قبولیت سے سَرفراز فرمائے اور روزِ محشر شفیع المذنبین سیّد الرّسل علیہ الصلوٰۃ والسلام کی شفاعت سے بہرہ مند فرمائے۔

آمین بجاہ سید الانبیاء والمرسلین

ساجد الرحمٰن

ڈائریکٹر جنرل دعوۃ اکیڈمی

نائب صدر بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد۔ پاکستان

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وَاَحْسَنَ مِنْکَ لَمْ تَرَ قَطُّ عَیْنِی
وَاَجْمَلَ مِنْکَ لَمْ تَلِدِ النِّسَاءُ
خُلِقْتَ مُبَرَّءًا مِّنْ کُلِّ عَیْبٍ
کَاَنَّکَ قَدْ خُلِقْتَ کَمَا تَشَاءُ

(حسان بن ثابتؓ)

تقریباً پونے چھ سو سال گزر چکے تھے کہ کرۂ ارض سے سلسلۂ نبوت منقطع ہو چکا تھا۔ سابقہ انبیاءِ کرام کی تعلیمات کے اثرات تقریباً ختم ہو چکے تھے۔ اللہ کے گھر میں تین سو ساٹھ بتوں کی پوجا ہو رہی تھی۔ جب زمین سے الٰہی تعلیمات کا سلسلہ منقطع ہو جائے اور صحفِ آسمانی رطب و یابس کا شکار ہو جائیں تو اخلاقیات کا بھی جنازہ اٹھ جاتا ہے۔ چنانچہ یہ دَور اخلاقی زبوں حالی کا دور تھا، مدنیت کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ اعمالِ بد کے مرتکبین اپنی بدکاری پر فرحاں و نازاں تھے۔ فسق و فجور، ظلم و جور اور جہالت کی ہمہ گیر تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ اس وقت کسی ایسے اُجالے کی ضرورت تھی جس کی نورانیت سے زمین کی تاریکی روشنی میں بدلے، جس کے واسطے سے مخلوق کا خالق سے رشتہ از سرِ نو استوار ہو۔ اس وقت ضرورت تھی ایسے پیغمبرِ انقلاب کی جو زندگی کے ہر شعبے میں حیات آفریں انقلاب پیدا کر دے، ضرورت تھی ایک ایسے مصلح کی جو دنیائے انسانیت کی اصلاح کا بیڑہ اٹھائے۔ اب وہ وقت آن پہنچا تھا کہ حضرت موسیٰ عَلَیْہِ السَّلَام اور حضرت عیسیٰ عَلَیْہِ السَّلَام کی خوشخبری منظرِ عام پر آئے۔ مُبَشِّرًا بِرَسُوْلٍ یَّاْتِیْ مِنْۢ بَعْدِی اسْمُهٗۤ اَحْمَدُ[6] چنانچہ ۱۲ ربیع الاول پیر کے دن (۲۲

---

6 الصف ۶:۶۱

اپریل ۵۷۱ء) کو یہ شرف و اعزاز حاصل ہوا کہ اس دن حضرت آمنہ کی گود میں اس بچے کی ولادت ہوئی جو سارے جہانوں کا، اوّلین و آخرین کا پیغمبر بنا کر بھیجا گیا۔ جس کی رحمت للعالمینی سے اپنوں اور غیروں، سب نے حسبِ استعداد رحمت و برکت حاصل کی۔ مولانا شبلی نعمانی نے اس تاریخ کی عظمت کا اظہار اپنے مخصوص اسلوب میں کیا ہے۔ "آج کی صبح وہی صبح جاں نواز، وہی ساعتِ ہمایوں، وہی دورِ فرخ فال ہے۔ اربابِ سیَر اپنے محدود پیرایۂ بیان میں لکھتے ہیں کہ آج کی رات ایوان کسریٰ کے ۱۴ کنگرے گر گئے، آتش کدۂ فارس بجھ گیا، دریائے سادہ خشک ہو گیا، لیکن سچ یہ ہے کہ ایوانِ کسریٰ نہیں، شانِ عجم، شوکتِ روم، اوجِ چین کے قصر ہائے فلک بوس گر پڑے، آتشِ فارس نہیں بلکہ جحیم شر، آتش کدۂ کفر، آذر کدہ گمر ہی سرد ہو کر رہ گئے، صنم کدوں میں خاک اڑنے لگی، بت کدے خاک میں مل گئے، شیرازۂ مجوسیت بکھر گیا، نصرانیت کے اوراقِ خزاں دیدہ ایک ایک کر کے جھڑ گئے۔ توحید کا غلغلہ اٹھا، چمنستانِ سعادت میں بہار آئی، آفتابِ ہدایت کی شعاعیں ہر طرف پھیل گئیں، اخلاقِ انسانی کا آئینہ پرَتوِ قدس سے چمک اٹھا"[7]۔ الغرض اس تاریخ کی عظمت کو دنیائے اسلام کا کوئی بھی مؤرخ نظر انداز نہیں کر سکے گا۔

ولادت سے پہلے یتیم

سرورِ عالم و عالمیان ﷺ کے والد ماجد کا اسم گرامی نام نامی حضرت عبد اللہ تھا۔ نبی کریم ﷺ کی ولادت سے چھ ماہ پہلے ان کا انتقال ہو چکا تھا۔ چنانچہ یتیموں کے مشفق و مہربان آقا نے جب اس عالمِ رنگ و بو میں آنکھ کھولی تو باپ کا سایہ سَر سے اٹھ چکا تھا۔

---

7 شبلی نعمانی، ص ۱۷۱

اسمِ گرامی نامِ نامی

سرورِ عالم ﷺ کی ولادتِ طیبہ کے سات دن بعد آپ کے دادا محترم نے آپ کی رسمِ "عقیقہ" ادا کی اور اسی دن آپ کا نام نامی "محمد" تجویز کیا۔ عرب میں اس طرح کا نام پہلے موجود نہیں تھا، اسی لیے یہ انوکھا نام سن کر رؤسائے قریش نے متعجبانہ انداز میں یہ نام تجویز کرنے کا سبب دریافت کیا جس کے جواب میں آپ کے دادا جان نے ارشاد فرمایا کہ میری یہ آرزو ہے کہ ساری دنیا میرے پوتے کے گن گائے۔ حضرت عبدالمطلب کی یہ امنگ اور آرزو تھی لیکن وہ نوشتۂ تقدیر سے آگاہ نہیں تھے کہ ان کے پوتے کو خداوند قدوس نے وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ ؕ[8] کا تاج پہنادیا ہے۔ عرب و عجم کے کونے کونے میں دن میں کئی مرتبہ آپ کے پوتے کا نام منبر و محراب سے گونجے گا اور کروڑوں انسان اس نام پر درود وسلام کے نذرانے پیش کر کے اپنے قلوب واذہان کو منور کریں گے۔

حلیمہ کے بخت جاگے

آنحضرت ﷺ کو سب سے پہلے آپ کی والدہ مکرمہ نے دودھ پلایا اور دو تین روز کے بعد ثویبہ کو یہ عزت نصیب ہوئی۔ سرورِ عالم ﷺ کی ولادت کے چند دن بعد قبیلہ ہوازن کی چھ عورتیں بچوں کی تلاش میں مکہ مکرمہ آئیں۔ انہی میں حلیمہ سعدیہ بھی تھیں، جن کی قسمت کو چار چاند لگنے والے تھے۔ اتفاق سے انہیں اور کوئی بچہ نہ ملا اور وہ یتیم بچہ ان کے حصے میں آیا جسے کروڑوں اربوں بچوں اور بڑوں کا مرکزِ عقیدت و محبت بننا تھا۔ حلیمہ تیری قسمت جاگ اٹھی، تو سرورِ عالم ﷺ کی رضاعی ماں بن گئی، قیامت تک نسلِ انسانی تیری عظمت کو سلام عقیدت پیش کرتی رہے گی۔

---

8 الم نشرح: ۴

سرورِ عالم ﷺ کی حلیمہ کے گھر پرورش کا آغاز ہوا اور خدائے قدوس نے اس نادار و مفلس خاتون کے لیے اپنی رحمتِ بے پایاں کے ابواب کو کھول دیا۔ حلیمہ سعدیہ کہتی ہیں کہ ہمارے پاس سواری کے لیے ایک لاغر کمزور اونٹنی تھی، اپنا یہ حال تھا کہ دودھ بالکل خشک ہو گیا تھا، بچے بھوک سے رو رو کر نڈھال ہو جاتے، مگر اس درِ یتیم کی آمد کی دیر تھی، جو پستان بالکل خشک تھے وہ دُودھ سے بھر آئے۔ اونٹنی کا دودھ دوہنے کے لیے اٹھے تو تھن دودھ سے بھرے ہوئے تھے، حلیمہ کے شوہر نے حلیمہ سے مخاطب ہو کر کہا

تَعَلَّمِی وَاللهِ حَلِیْمَہ تَعدَ اَخَذْتِ نَسْمَۃً مُبَارَکَۃ

اے حلیمہ! خوب سمجھ لے کہ خدا کی قسم تو نے بہت ہی مبارک بچہ لیا ہے۔

سرورعالم ﷺ کی عمر مبارک جب دو سال ہو گئی تو حلیمہ سعدیہ آپ کو لے کر آپ کی والدہ ماجدہ کی خدمت میں حاضر ہوئیں[9]۔ ان دنوں مکہ میں وبا پھیلی ہوئی تھی۔ اس لیے حضرت حلیمہ سعدیہ کی درخواست پر آپ کو مزید کچھ وقت کے لیے واپس بھیج دیا گیا۔

واقعہ شقِ صدر

سرورِ عالم ﷺ ایک دن حسبِ معمول اپنے رضاعی بھائیوں کے ہمراہ بکریاں چرا رہے تھے کہ ایک عجیب و غریب واقعہ پیش آیا جس نے آپ کے رضاعی بھائیوں کو پریشانی میں مبتلا کر دیا اور وہ بھاگم بھاگ گھر پہنچے اور اپنی والدہ اور والد کو بتایا کہ دو آدمی جو

---

[9] سیرت ابن ہشام جلد ا، ص ۵۵

سفید لباس میں ملبوس تھے آئے اور انہوں نے ہمارے قریشی بھائی کو زمین پر لٹا کر ان کا شکم مبارک چاک کیا اور اب آپ کے شکم مبارک کو سی رہے ہیں۔ یہ واقعہ سن کر حلیمہ اور ان کے خاوند پریشانی میں مبتلا ہو گئے۔ وہ انتہائی خوف زدہ حالت میں دوڑتے ہوئے سرورِ عالم ﷺ کے پاس پہنچے۔ دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ ایک جگہ کھڑے ہیں، آپ کے چہرۂ انور کا رنگ فق ہے۔ حلیمہ سعدیہ فرماتی ہیں کہ ہم دونوں نے آپ کو سینے سے چمٹا لیا اور ہمارے پوچھنے پر آپ نے سارا واقعہ بیان فرمایا۔

مولانا محمد ادریس کاندھلوی نے واقعہ شقِ صدر کو اپنی کتاب سیرتِ مصطفیٰ ﷺ میں بڑی تفصیل اور وضاحت سے نقل کیا ہے۔ آپ لکھتے ہیں کہ: شقِ صدر کا واقعہ نبی اکرم ﷺ کو چار مرتبہ پیش آیا۔ ایک مرتبہ اس وقت جبکہ آپ حلیمہ سعدیہ کی پرورش میں تھے (جس کا ذکر اوپر ہوا) اور اس واقعہ کا تذکرہ متعدد روایات میں موجود ہے۔ دوسری مرتبہ شق صدر کا واقعہ آپ کو دس سال کی عمر میں پیش آیا۔ تیسری مرتبہ بعثت کے وقت اور چوتھی مرتبہ یہ واقعہ معراج کے وقت پیش آیا جیسا کہ بخاری، مسلم، ترمذی اور نسائی وغیرہ میں ابوذرؓ سے مروی ہے اور اس بارے میں روایتیں متواتر اور مشہور ہیں۔[10]

والدہ کی جدائی

جب آپ نے عمر کے چھٹے سال میں قدم رکھا تو آپ کی والدہ ماجدہ نے یثرب (مدینۃ النبی) جانے کا قصد کیا اور اس سفر میں آپ کو بھی ساتھ لے گئیں۔ یثرب میں آپ ﷺ کی ننھیال تھی۔ چنانچہ آپ کی والدہ مکرمہ نے تقریباً ایک ماہ اپنے میکے میں قیام کیا۔ ایک ماہ بعد آپ اپنے بیٹے اور شریکِ سفر اُم ایمن کے ساتھ مکہ معظمہ کے لیے روانہ

---

10 سیرۃ مصطفیٰ ج۱، ص۶۱ تا ۶۳

ہوئیں۔ راستے میں ابوا نامی مقام پر حضرت آمنہ نے انتقال فرمایا اور وہیں آپ کو دفن کر دیا گیا۔ یہاں سے آپ اُم ایمن کے ساتھ مکہ مکرمہ پہنچے۔ گویا چھ سال کی کم عمری ہی میں آپ والدہ کے سایۂ رحمت سے بھی محروم ہو گئے۔

شرفِ پرورش

اُم ایمن آپ کو لے کر مکہ مکرمہ پہنچیں اور آپ کو آپ کے دادا محترم کی خدمت میں پیش کیا اور یوں آپ کے والدین کے انتقال کے بعد سب سے پہلے آپ کے دادا کو آپ کی تربیت و نگہبانی کا شرف و اعزاز نصیب ہوا۔ حضرت عبد المطلب کو آپ سے بے حد پیار تھا۔ تقریباً دو سال تک آپ اپنے دادا کی کفالت میں رہے۔ جب آپ آٹھ سال کی عمر کو پہنچے تو شفیق و مہربان دادا کا سایہ بھی سر سے اُٹھ گیا۔ حضرت عبد المطلب نے بوقتِ مرگ آپ کو آپ کے حقیقی چچا جناب ابو طالب کے حوالے کر دیا اور وصیت فرمائی کہ ہمیشہ شفقت و مہربانی سے پیش آنا۔

ابو طالب کی کفالت

دادا کی وفات کے بعد اپنے والد کی وصیت کے مطابق جناب ابو طالب نے آپ کی تربیت و پرورش کو فقید المثال حسن و خوبی سے سر انجام دیا، آپ نے مرتے دم تک اس فرض کا حق ادا کیا، بڑے مشکل اور کٹھن حالات میں آپ نے نہایت عزم و ثبات کا نمونہ پیش کیا۔ ہر قسم کی تکالیف برداشت کیں مگر کفالتِ محمد ﷺ سے دستبردار نہ ہوئے۔

نورِ نبوت کے آثار

حضرت ابو طالب کا ذریعۂ روزگار تجارت تھا۔ تجارتی معاملات کے سلسلے میں ایک مرتبہ جب آپ نے دمشق جانے کے لیے رختِ سفر باندھا تو سرورِ عالم ﷺ نے آپ

کی معیت میں جانے کی خواہش ظاہر کی۔ حضرت ابو طالب خود بھی آپ کی جدائی برداشت نہیں کرتے تھے اور ہمہ وقت آپ کو اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ چنانچہ آپ کو بھی اس سفر میں شامل کر لیا۔ حسبِ معمول یہ قافلہ سرزمینِ شام کے مقام بصریٰ میں اترا۔ یہاں قریب ہی ایک کلیسا تھا جس میں بُحیرہ نامی ایک راہب مقیم تھا۔ جب یہ قافلہ آرہا تھا تو وہ کلیسا میں کھڑا قافلے کو آتے دیکھ رہا تھا۔ ایک عجیب و غریب منظر نے اسے استعجاب میں مبتلا کر دیا۔ راہب نے دیکھا کہ قافلے میں ایک چھوٹا سا بچہ بھی شامل ہے اور اس بچے کو دھوپ سے محفوظ رکھنے کے لیے ایک ابر کا ٹکڑا سایہ کیے ہوئے ہے اور مسلسل آپ کے سرِ اقدس پر آپ کے ساتھ ساتھ سفر کر رہا ہے۔ اس غیر معمولی واقعہ نے راہب کو یقین دلایا کہ یہ بچہ غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔ چنانچہ اس نے تمام قافلے والوں کی دعوت کا اہتمام کیا اور دعوت سے فارغ ہو کر جب سب ادھر ادھر چلے گئے تو سرورِ عالم ﷺ کے قریب آیا، آپ کو لات و عزیٰ کی قسم دے کر آپ سے کہنے لگا کہ میں جو کچھ بھی آپ سے پوچھوں گا آپ سچ سچ بتائیں گے۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا:

"لَا تَسْأَلْنِیْ بِالَّاتِ وَالْعُزّٰی فَوَاللّٰہِ مَا اَبْغَضْتُ شَیْئًا قَطُّ بُغْضِہِمَا"

لات و عزیٰ کی قسم دے کر مجھ سے مت پوچھو، خدا کی قسم مجھے ان دونوں سے جتنا بغض ہے کسی اور چیز سے نہیں۔

چنانچہ راہب نے آپ کو خدا کی قسم دے کر کہا کہ آپ سے جو چیز پوچھوں آپ اس کا صحیح جواب دیجیے۔ راہب نے آپ سے مختلف النوع سوالات کیے اور جوابات سن کر اس کا یقین مزید پختہ ہو گیا کہ یہ بچہ غیر معمولی عزت و عظمت کا حامل ہے۔ راہب کے استفسار پر جب اسے معلوم ہوا کہ ابو طالب آپ کے سرپرست ہیں تو انہیں مشورہ دیا کہ

[11] سیرت ابن ہشام، ص ۲۶۴

جتنا جلدی ممکن ہو اس بچے کو واپس لے جایئے۔ ابو طالب نے آپ کو حضرت ابو بکر اور حضرت بلال کے ہمراہ واپس بھیج دیا۔ بعض سیرت نگاروں کے خیال میں اس روایت میں حضرت ابو بکر اور حضرت بلال کا ذکر درست نہیں ہے۔

حلفُ الفُضول

عـــرب قوم کی نسل پرستی، تفاخر، عناد، ضد اور ہٹ دھرمی کے قصوں سے تاریخ کے اوراق بھرے پڑے ہیں۔ قتل و غارت، لوٹ مار اور وحشت و بربریت ان کی فطرتِ ثانیہ بن چکی تھی۔ اونٹوں کو پانی پلانے میں تقــدیم و تاخیر کے معمولی جھگڑوں پر سینکڑوں افراد بے دریغ تیغ و سناں کا لقمہ بن جاتے تھے۔ لڑائیوں کے اس ختم نہ ہونے والے سلسلے نے کئی گھر برباد کر دیا تھے۔ ہر روز کی اس سفاکی اور ظلم نے بعض لوگوں کے دلوں میں یہ تحریک پیدا کی کہ کوئی اصلاحی قدم اٹھایا جائے۔ چنانچہ جب لوگ جنگِ فجار سے واپس آئے تو زبیر بن عبد المطلب نے یہ تجویز پیش کی اور نتیجتاً خاندانِ بنو ہاشم، زہرہ اور تیم، عبد اللہ بن جدعان کے گھر میں جمع ہوئے اور معاہدہ ہوا کہ ہم میں سے ہر شخص مظلوم کی حمایت کرے گا اور کوئی ظـالم مکہ میں نہ رہنے پائے گا[12]۔

آنحضرت ﷺ بنفس نفیس اس معاہدے میں شریک تھے، اور اس معاہدے میں شرکت کا بہت خوشی سے اظہار فرمایا کرتے تھے۔ بعثت کے بعد جب کبھی اس معاہدے کا ذکر آتا تو آپ ﷺ فرماتے "اس معاہدے کے مقابلے میں اگر مجھ کو سرخ رنگ کے اونٹ بھی دے دیے جاتے تو میں نہ لیتا اور آج بھی اس معاہدے پر کوئی بلائے تو

---

12 طبقات جلد ۱، ص ۸۲

میں حاضر ہوں"[13]۔

اس معاہدے کو حلف الفضول اس لیے کہتے ہیں کہ اوّل اوّل اس معاہدے کا جن لوگوں کے دل و دماغ میں خیال پیدا ہوا ان کے ناموں میں لفظِ فضل کا مادہ شامل تھا۔

۱: فضیل بن حرث ۲: فضیل بن واعہ اور ۳: مفضل

مکہ کا امین

اکلِ حلال اسلامی تعلیمات کا خاصہ ہے، آنحضرت ﷺ نے اپنی تعلیماتِ عالیہ میں حلال روزی کمانے پر شدت سے زور دیا ہے۔ چنانچہ آپ نے بعثت سے بہت پہلے اپنے لیے تجارت کو ذریعۂ روزگار بنایا۔ اس شغل نے آپ کی طبعی شرافت و دیانت کو عوام پر آشکارا کر دیا۔ مکہ کے رہنے والوں میں آپ امین و صادق کے نام سے مشہور ہو گئے۔ مکہ کے رؤساء اپنی امانتوں کی حفاظت کے لیے آپ کے آستان سے زیادہ کسی مقام کو مامون نہیں پاتے تھے۔ چنانچہ اپنی امانتیں آپ کے سپرد کر دیتے تھے۔ در حقیقت اللہ جل شانہٗ یہ بیّن دلائل جمع فرما رہے تھے، کفار مکہ کے لیے کہ کل جب اعلانِ نبوت ہو گا تو اعلان کرنے والے کی عملی زندگی کا ایک ایک لمحہ ان کی نظروں کے سامنے ہو گا، ان کے سامنے وہ شخص خدا کا پیغام لے کر کھڑا ہو گا جس کو وہ سب بیک آواز صادق و امین کے نام سے پکارتے تھے۔ اُس وقت اگر وہ اس کی تکذیب کریں گے تو عقل و فکر والوں کے لیے ان کا یہ عمل باعثِ تفکر ہو گا۔ یہ لوگ کل تک جس ہستی کے گن گا رہے تھے، جس کی سچائی پر یقین رکھتے تھے، اسے جھوٹا ثابت کرنے کے لیے زمین و آسمان کے قلابے کیوں ملا رہے ہیں۔ الغرض اسرارِ الٰہی کے تحت بعثت سے پہلے آپؐ کی پاکیزہ سیرت کے نقوش ثبت ہو رہے تھے۔

---

[13] مستدرک جلد ۲، ص ۲۲۰

حضرت خدیجہؓ سے عقد

جب آپ کی عمر شریف پچیس سال کی ہوئی تو آپ کے صدق و امانت کے چرچے گھر گھر ہو رہے تھے۔ دُور دُور تک آپ کی نیک نامی کا چرچا تھا، آپ کے انہی اوصافِ حمیدہ سے متاثر ہو کر قبیلہ قریش کی ایک معزز، محترم اور دولت مند خاتون حضرت خدیجہؓ نے آپؐ کو پیغام بھیجا کہ آپ میرا مالِ تجارت لے کر شام جائیں، جو معاوضہ میں اوروں کو دیتی ہوں اس کا دگنا آپ کو دوں گی۔ آپ نے اپنے چچا حضرت ابو طالب سے اس معاملہ میں مشورہ فرمایا اور ان کی رضامندی سے حضرت خدیجہ کا مالِ تجارت لے کر شام روانہ ہو گئے، حضرت خدیجہ کا غلام میسرہ بھی آپ کا شریکِ سفر تھا، آپ بصریٰ کے بازار میں نسطورا راہب کی خانقاہ کے پاس اُترے۔ راہب میسرہ کو پہلے سے ہی پہچانتا تھا، وہ میسرہ کے قریب آیا اور کہا کہ اے میسرہ! یہ کون ہے جو اس درخت کے نیچے اترا ہے؟ میسرہ نے جواب دیا اہلِ حرم میں سے قریش سے ہے۔ راہب نے کہا، سوائے نبی کے اس درخت کے نیچے کوئی نہیں اُترا۔ پھر اس نے پوچھا کیا اس کی دونوں آنکھوں کے درمیان سرخی ہے؟ میسرہ نے جواب دیا، ہاں اور کبھی دور نہیں ہوتی، یہ سنتے ہی راہب بولا "یہ وہی ہیں اور یہی آخر الانبیاء ہیں، کاش میں ان کو پاؤں جس وقت یہ مبعوث ہوں گے"۔

اللہ جل شانہٗ نے اس سفر تجارت میں آپ کو بہت زیادہ نفع سے سرفراز فرمایا۔ واپس مکہ پہنچے تو میسرہ نے تمام حالات سے حضرت خدیجہ کو آگاہ کر دیا اور آپ ﷺ کی شرافت و دیانت کا تفصیل سے ذکر کیا تمام شواہد بیان کیے۔ حضرت خدیجہ بے حد متاثر ہوئیں، اس وقت وہ بیوگی کی زندگی بسر کر رہی تھیں۔ اس سے پہلے ان کی دو شادیاں ہو چکی تھیں۔ اپنی عفت و پاک دامنی کے سبب طاہرہ کے نام سے پکاری جاتی تھیں۔ ان کا سلسلۂ نسب پانچویں پشت میں آپ ﷺ سے جا ملتا تھا۔ حضرت خدیجہؓ نے آپ کے حالات،

معاملات اور پاکیزہ کردار کو سامنے رکھتے ہوئے یہ فیصلہ کر لیا کہ وہ آپ کے ساتھ رفیقۂ حیات کا رشتہ استوار کریں گی۔ چنانچہ شام کے سفر کے تین ماہ بعد آپ کو نکاح کا پیغام بھیجا۔ آپ ﷺ نے اپنے چچاؤں سے مشورہ کیا۔ انہوں نے بھی حضرت خدیجہ کے اس فیصلے کو قبول کر لیا۔ چنانچہ تاریخ مقرر کی گئی۔ معینہ تاریخ پر آپ اپنے چچا حضرت ابو طالب اور حضرت حمزہ کے ہمراہ تشریف لے گئے۔ حضرت ابو طالب نے خطبہ نکاح پڑھا۔ پانچ سو درہم مہر مقرر ہوا۔ یہ آپ کی پہلی شادی تھی۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے اور شادیاں کیں مگر آپ ﷺ کی تمام اولاد حضرت خدیجہؓ کے بطن سے ہی ہوئی۔ صرف ایک صاحبزادے جن کا نام ابراہیم تھا حضرت ماریہ قبطیہؓ کے بطن سے ۸ھ پیدا ہوئے اور ۱۰ھ میں انتقال فرما گئے۔

منصف کا کردار

آنحضرت ﷺ کی عمر کے پینتیسویں برس میں اہلِ مکہ نے حرم کعبہ کی عمارت کو منہدم کر کے از سرِ نو اسے تعمیر کیا۔ قریش کے تمام قبائل نے مل کر کعبہ کی تعمیر میں حصہ لیا، دو دو مرد مل کر دور دور سے پتھر اٹھا کر لاتے تھے۔ آپ ﷺ اپنے چچا عباس کے ساتھ شریک تھے۔ جب عمارت کی تعمیر حجرِ اسود تک پہنچ گئی تو قبائلی عصبیت جاگ اٹھی۔ ہر قبیلہ کی خواہش تھی کہ حجرِ اسود نصب کرنے کا اعزاز ہم ہی حاصل کریں۔ معاملہ بہت نزاعی صورت اختیار کر گیا۔ قریب تھا کہ تلواریں نیام سے باہر آ جاتیں کہ ابو امیہ بن مغیرہ مخزومی نے یہ رائے پیش کی کہ کل صبح جو شخص اس مسجد کے باب بنی شیبہ سے پہلے داخل ہو، وہ ثالث قرار دیا جائے، سب نے اس رائے سے اتفاق کیا۔ دوسرے روز سب سے پہلے داخل ہونے والے ہم سب کے آقا حضرت محمد ﷺ تھے۔ سب دیکھتے ہی پکار اٹھے "یہ امین ہیں، ہم ان پر راضی ہیں" چنانچہ آپ ﷺ نے نہایت عمدہ تدبیر سے انتہائی بگڑے ہوئے معاملے

کو سلجھادیا اور قریشیوں کو خون خرابہ سے بچالیا۔ آپ نے ایک چادر بچھائی۔ مختلف قبائل کے سرداروں سے فرمایا کہ چادر کے مختلف کونوں کو پکڑ کر اوپر اٹھائیں۔ سب نے یونہی کیا، جب چادر مقامِ نصب کے قریب پہنچی تو آپ نے اپنے دست مبارک سے حجرِ اسود کو اٹھا کر دیوار میں نصب کر دیا۔

حیاتِ طیبہ، نبوت و رسالت سے پہلے

عرب کا وہ معاشرہ جس میں سرور عالم ﷺ نے آنکھ کھولی، بچپن اور جوانی کے مراحل سے گزرے، اس کی معاشرتی اخلاقی زبوں حالی تاریخ کا ایک مستقل باب ہے۔ قمار بازی، شراب نوشی، بت پرستی اور بے حیائی معاشرے کا جزو بن چکی تھی۔ ایک خدا کی بجائے تین سو ساٹھ بتوں کی پرستش ہو رہی تھی۔ خفیہ برائی سے لے کر سرِعام بے حیائی تک ہر چیز روا تھی۔ اخلاقی گراوٹ کی انتہا دیکھئے کہ موروثی جائیداد کی طرح باپ کی بیویاں بھی بیٹے کو ورثے میں ملتی تھیں۔ قومی و نسبی عصبیت کا یہ عالم تھا کہ اونٹوں کو پانی پلانے کی تقدیم و تاخیر پر قتل و غارت گری کا ایک ایسا بازار گرم ہوتا تھا کہ خون کی ندیاں بہادی جاتی تھیں۔ الغرض اس ماحول میں جنابِ محمد ﷺ کی ولادت ہوتی ہے۔ وہ یہاں کے بچوں میں کھیلتے ہیں مگر اس بچے میں عام بچوں کی طرح کی کوئی بات نہیں، وہ بزرگوں کی سی متانت کا مظہر نظر آتا ہے۔ اخلاقی عیوب سے پراگندہ ماحول میں پرورش پاتا ہے۔ عقلِ انسانی یہ دیکھ کر حیران رہ جاتی ہے کہ جہاں گھر گھر شراب کا کاروبار ہو، جہاں اخلاق و شرافت کا کوئی معیار نہ ہو، وہاں عظمت و شرافت کا پیکر یہ نوجوان شراب کو چھوتا بھی نہیں ہے۔ مؤرخین لکھتے ہیں کہ قصہ گوئی اس معاشرہ کا ایک محبوب مشغلہ تھا لیکن اس ارفع و اعلیٰ ہستی کو اس سے دُور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔ موسیقی عربوں کا اوڑھنا بچھونا تھا مگر آپ کو اس قسم کے لہو و لعب سے سخت نفرت تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ اس نوجوان نے اپنے ہم قوم اور ہم وطنوں سے اپنی دیانت اور شرافت

اوراخلاقی برتری کا لوہا منوالیا۔ الصادق اور الامین کا خطاب اتنا عام ہوا کہ موافق اور مخالف سب کی زبانیں اس کا اقرار کرنے لگیں، اس کی شرافت کی قسمیں کھائی جانے لگیں۔ جب اس نوجوان نے معاشی میدان میں قدم رکھا تو عرب کے ہر سردار کی یہ خواہش تھی کہ یہ نوجوان اس کا شریکِ معاملہ ہو جائے اور جب قریش کی ایک خاتون کو یہ سعادتِ عظمیٰ حاصل ہوئی کہ آپ نے اس کے مال سے تجارت کی تو وہ خاتون آپ کی دیانت سے اس قدر متاثر ہوئی کہ اپنے جسم و جان کو آپ کے سپرد کر کے رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو گئی۔ کہا جاتا ہے کہ کسی شخص کی اخلاقی حالت کا اندازہ کرنا ہو تو اس کے حلقۂ یاراں کو ایک نظر دیکھیے۔ ان کے اخلاق و کردار کو دیکھ کر خود بخود اندازہ ہو جائے گا کہ یہ شخص کس کردار کا مالک ہے۔ آپ ﷺ کے زمانۂ نبوت سے پہلے کے احباب کی فہرست دیکھیے۔ حضرت صدیق اکبرؓ، حکیم بن حزامؓ، ضماد بن ثعلبہ ازدیؓ، الغرض آپ کی صحبت میں بیٹھنے والا ہر شخص فطرت سلیم کا حامل تھا۔

آپ ﷺ نے سیرت و کردار اور قول و فعل کی ہم آہنگی کا وہ نمونہ پیش کیا کہ دنیائے انسانیت آپ کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب آپ نے دعویٰ نبوت کیا اور قریش نے آپؐ کے دعوے کی تکذیب کی تو خداوند قدوس نے محمد ﷺ کی معجزانہ سیرت کا حوالہ دیتے ہوئے ارشاد فرمایا:

فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِّن قَبْلِهِ ۚ أَفَلَا تَعْقِلُونَ [14]

اے گروہِ قریش! میری پیدائش تمہارے درمیان ہوئی، میرا بچپن تمہاری آنکھوں کے سامنے گزرا، میں تمہارے ہی سامنے جوانی کی منزل تک پہنچا۔ بتاؤ تم نے ان تمام مراحل میں مجھے کہیں بھٹکا ہوا پایا، مجھے کسی غلط راہ پر گامزن دیکھا۔ تاریخ گواہ ہے کہ ان

---

[14] یونس: ۱۶

سوالات کا جواب قریش کے پاس سوائے خاموشی کے اور کچھ نہ تھا۔ اور بے شک آنے والے زمانے میں بھی کوئی بڑے سے بڑا دشمنِ اسلام حضرت محمد ﷺ کی پاکیزہ زندگی پر انگشت نمائی نہ کر سکے گا۔

ظہورِ نبوّت

آپ ﷺ اپنی فطرت سلیم کے باعث رسومِ جاہلیت سے بے حد متنفر اور اس وقت کے معاشرتی ماحول سے انتہائی بے زار تھے۔ اس بے زارگی کے باعث آپ ﷺ مکہ سے باہر تقریباً تین میل کے فاصلے پر کوہِ حرا کی ایک غار میں چلے جاتے۔ خورد و نوش کے لیے کھجور، ستو اور پانی اپنے ساتھ لے جاتے اور عبادت میں مصروف رہتے۔ یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس وقت آپ کس کی عبادت کرتے تھے، اس عبادت کی کیا کیفیت ہوتی تھی؟ چنانچہ عینی شرح بخاری میں اس سوال کا جواب یوں دیا گیا:

قِيْلَ مَاكَانَ صِفَّةَ تَعْبُدِهٖ اجِيْب بِاَنْ ذَالِكَ بِالْتَّفَكُّرِ وَ لِاِعْتِبَارِ

یہ سوال کیا گیا ہے کہ آپ کی عبادت کیا تھی، جواب یہ ہے، غور و فکر اور عبرت پذیری۔

الغرض آپ ﷺ کا یہ معمول بن گیا تھا اور جب تک خورد و نوش کا سامان ختم نہ ہوتا، آپؐ غارِ حرا میں تشریف رکھتے تھے۔ جب آپ ﷺ کی عمر چالیس برس ہوئی اور آپ حسبِ معمول عبادت میں مصروف تھے کہ وہ گھڑی آن پہنچی کہ زمین کا رابطہ پھر اسمان سے جڑ جائے، خزاں رسیدہ ماحول میں بہار کی ساعت کا آغاز ہوگیا، فرشتہ غیب کا ظہور ہوا، جبرائیلؑ بارگاہِ مصطفیٰ ﷺ میں حاضر ہوئے اور فرمایا:

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِىْ خَلَقَ ۚ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۚ اِقْرَاْ وَرَبُّكَ

الْاَكْرَمُۙ﴿۳﴾ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِۙ﴿۴﴾ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْؕ﴿۵﴾ [15]

اپنے رب کے نام سے پڑھ جس نے پیدا کیا انسان کو ایک لوتھڑے سے۔ پڑھ اور تیرا رب سب سے بڑھ کر بزرگی والا ہے، جس نے قلم کے ذریعے سے علم سکھایا۔ انسان کو سکھایا جو وہ نہیں جانتا تھا۔

یہ ہے وہ پہلی وحیٔ الٰہی ہے جو سرورِ عالم ﷺ پر نازل ہوئی اور یوں نبوت محمدیؐ کا آغاز ہوا۔

اُتر کر حرا سے سُوئے قوم آیا
اور اِک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا

(حالیؔ)

یہ واقعہ معمولی اہمیت کا حامل نہ تھا۔ چنانچہ آپ بہت خوف زدہ ہوئے، گھر پہنچ کر لیٹ گئے اور حضرت خدیجہؓ سے ارشاد فرمایا کہ مجھ پر کمبل ڈالو۔ جب طبیعت میں ذرا ٹھہراؤ پیدا ہوا تو پیش آمدہ واقعہ کی تفصیل سے حضرت خدیجہؓ کو آگاہ کیا۔ حضرت خدیجہؓ خصائص محمد ﷺ کی رازدان تھیں، آپؐ کی حیات ایک کھلی کتاب کی مانند ان کی نظروں کے سامنے تھی۔ جنابہ خدیجہؓ نے جو جواب دیا وہ آنحضرت ﷺ کی حیاتِ طیبہ پر ایک مفصل تبصرہ ہے۔ حضرت خدیجہؓ نے فرمایا:

كَلَّا وَاللهِ لَا يُخْزِيْكَ اللهُ اَبَدًا اِنَّكَ لَتَصِلُ الرَّحِمَ وَ تَحْمِلُ الْكَلَّ وَتَكْسِبُ الْمَعْدُوْمَ وَ تُعِيْنُ عَلٰى نَوَآئِبِ الْحَقِّ [16]

ہرگز نہیں! خدا کی قسم اللہ آپ کو کبھی رسوا نہ کرے گا۔ آپ صلہ

---

15 العلق: ۱تا۵

16 بخاری باب بدء الوحی ج۱، ص۲

رحمی کرتے ہیں، لوگوں کا بوجھ اٹھاتے ہیں، ناداروں کی خبر گیری کرتے ہیں اور مصائب میں لوگوں کی مدد کرتے ہیں۔

ابن جریر کی ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت خدیجہ نے یہ بھی فرمایا: مَاأَتَيْتَ فَاحِشَةً قَطُّ "آپ کبھی کسی فاحشہ کے پاس بھی نہیں بھٹکے"۔

مولانا ادریس کاندھلویؒ حضرت خدیجہؓ کے کلام کو خلاصے کے طور پر پیش کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

جو شخص ایسے محاسن اور کمالات اور ایسے محامد اور پاکیزہ صفات اور ایسے اخلاق و شمائل اور ایسے معالی اور فضائل کا مخزن اور معدن ہو اس کی رسوائی ناممکن ہے، وہ نہ دنیا میں رسوا ہو سکتا ہے نہ آخرت میں، حق تعالیٰ شانہ' جس کو اپنی رحمت سے یہ محاسن اور کمالات عطا فرماتے ہیں اس کو ہر بلا سے اور ہر آفت سے محفوظ رکھتے ہیں"[17]۔

بعد ازاں حضرت خدیجہؓ آپؐ کو اپنے چچازاد بھائی ورقہ بن نوفل کے پاس لے کر گئیں۔ ورقہ توریت اور انجیل کے عالم تھے۔ ورقہ بن نوفل کے استفسار پر آپ ﷺ نے تمام واقعات من و عن بیان فرمائے۔ ورقہ نے جب کلام الٰہی سنا اور تمام کیفیت اس کے علم میں آگئی تو اس نے کہا: "یہ وہی ناموس (فرشتہ) ہے جو موسیٰ علیہ السلام پر اترتا تھا۔ کاش میں اس وقت زندہ ہوتا جب تمہاری قوم تمہیں تمہارے وطن سے نکالے گی"۔ سرور عالم ﷺ نے اظہارِ تعجب فرمایا کہ وہ مجھ کو نکالیں گے۔ ورقہ نے کہا: "ہاں جو بھی اللہ کا کلام اور اس کا پیام لے کر آیا لوگ اس کے دشمن ہو گئے"۔

---

17 سیرۃ المصطفیٰؐ، ص ۱۱۵

دعوت کا ابتدائی دور

سرورِ عالم ﷺ کی نبوت کا ظہور ہو چکا تھا۔ چنانچہ آپؐ نے دعوتِ اسلامی کا آغاز فرمادیا لیکن فی الحال تبلیغ کا یہ کام انتہائی رازدارانہ طریق سے شروع کیا گیا۔ اوّل اوّل آپ نے اُن سلیم الفطرت انسانوں کو دعوتِ توحید دی جن کے قلب وذہن پہلے سے ہی ہدایت کے متلاشی تھے اور وہ لوگ آپ ﷺ کے سیرت وکردار کی پاکیزگی سے بخوبی واقف تھے۔ آپؐ کی زوجہ ٔمحترمہ حضرت خدیجہؓ جو آپ کی خلوت وجلوت کی رازداں تھیں، وہ تو دعویٰ نبوت سنتے ہی بلا کسی تردد اور شک وشبہ آپ پر ایمان لے آئیں۔ اس کے بعد دولتِ ایمان سے سرفراز ہونے والا آپ کا وہ دوست ہے جس کی رفاقت آج ضرب المثل بن چکی ہے۔ کوئی آپ کو رفیقِ ہجرت کے نام سے یاد کرتا ہے اور کوئی یارِ غار کہہ کر آپ کی عظمت کا اعتراف کرتا ہے۔ یہ تھے حضرت سیدنا صدیق اکبرؓ جن کے سامنے جونہی آپ نے حقانیت اسلام پیش کی، آپؓ نے سرتسلیم خم کر دیا۔ تیسرے نمبر پر آپ کے چچازاد بھائی حضرت علیؓ کا اسمِ گرامی نام نامی آتا ہے۔ آپؓ نے سرورِ دوعالم ﷺ کی زیر نگرانی پرورش پائی۔ بچوں میں آپ کو سب سے پہلے آپ ﷺ پر ایمان لانے کا شرف واعزاز حاصل ہوا۔ غلاموں میں سب سے پہلے ایمان لانے والے زید بن حارثہؓ تھے۔ حکیم بن حزامؓ انہیں شام سے خرید کر لائے تھے، بعد ازاں حضرت خدیجہ جو حکیم کی پھوپھی تھیں، نے زید کو لے لیا۔ حضرت خدیجہ زوجہ رسول اللہ ﷺ کے منصب پر فائز ہوئیں تو آپؐ نے ان سے زید کو مانگ لیا، زید کے والد تلاشِ بسیار کے بعد زید کو حاصل کرنے کے لیے آپؐ کے پاس حاضر ہوئے، آپ ﷺ نے زید کو اختیار دے دیا کہ وہ چاہیں تو جاسکتے ہیں لیکن زید کو جو شفقت ومحبت آپؐ کے زیر سایہ میسر تھی وہ شفقت پدری سے کہیں بڑھ کر تھی۔ آپ ﷺ نے اپنے والد کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا۔ زید رسول اللہ ﷺ کے زیرِ سایہ پرورش پاتے

رہے تا آنکہ آپ ﷺ کو منصبِ نبوت پر فائز کیا گیا اور زیدولتِ ایمانی سے سرفراز ہوئے۔

عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ کسی مصلح سے قریب ترین لوگ اس کی عظمت کے معترف نہیں ہوتے اور اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اس کی زندگی کا وہ حصہ جو غیروں کی نظروں سے پوشیدہ ہوتا ہے، وہ اس سے بھی واقف ہوتے ہیں لیکن سیّد دو عالم ﷺ کی سیرت و کردار کا اعزاز دیکھیے کہ سب سے پہلے آپ کی تصدیق کرنے والے وہ اصحاب ہیں جو آپ کی خلوت و جلوت کے رزاداں ہیں۔ بیوی سے زیادہ کون کسی شخص کا رازداں ہو سکتا ہے، انسان ساری دنیا سے چھپ سکتا ہے لیکن بیوی کی آنکھوں سے اپنے آپ کو پوشیدہ رکھنا ناممکن ہے لیکن سیرتِ مصطفیٰ ﷺ کا کمال تو دیکھیے کہ آپ ﷺ پر سب سے پہلے ایمان لانے والی آپ کی زوجۂ محترمہ ہیں، آپؐ کے قریب ترین دوست ابو بکرؓ ہیں، آپؐ کے گھر میں پرورش پانے والے علی المرتضیٰؓ ہیں اور آپ ﷺ کے آزاد کردہ غلام زید بن حارثہؓ ہیں اور پھر ان اصحاب کی رفاقت وقتی نہ تھی بلکہ تاریخ کا ایک ایک ورق ان کے عزم و ثبات پر روشن دلائل مہیا کر رہا ہے، انہوں نے مصائب و آلام کے پہاڑ برداشت کیے، خویش و اقارب کو چھوڑ دیا، مال و متاع سے ہاتھ کھینچ لیا لیکن دامن مصطفیٰ ﷺ کو ہاتھ سے نہ چھوٹنے دیا۔

ان لوگوں کے علاوہ خفیہ تبلیغ کے اثرات سے اور بھی بہت سے لوگ ایمان لے آئے۔ اور اس سلسلے میں حضرت ابو بکرؓ نے اہم کردار ادا کیا۔ آپ کی تبلیغی مساعی کے نتیجے میں حضرت عثمانؓ، حضرت زبیرؓ، حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف، حضرت سعدؓ بن ابی وقاص، حضرت طلحہؓ مشرف بہ اسلام ہوئے۔

دعوت توحید و رسالت کا یہ مرحلہ انتہائی رازدارانہ ماحول میں جاری رہا اور تقریباً تین سال تک یہی انداز رہا لیکن یہ دور بھی بہت ہی کامیاب رہا، ہر چند کہ اس زمانے میں ایمان لانے والے دولت و ثروت سے مال مال نہیں تھے، معاشرے کے کمزور افراد میں ان کا

شمار ہوتا تھا لیکن زمانہ گواہ ہے کہ ان ہی کمزوروں کو جب ہادیٔ کامل کی رہنمائی میسر آئی تو انہوں نے قیصر وکسریٰ کی دھجیاں اڑادیں اور شوکتِ اسلام کا پھریرا اکنافِ عالم میں لہرادیا۔

کوہِ صفا سے اعلانِ توحید

وہ بجلی کا کڑکا تھا یا صوتِ ہادی
عرب کی زمیں جس نے ساری ہلا دی
(حالیؔ)

خفیہ تبلیغ کا سلسلہ جاری تھا کہ حکم باری تعالیٰ نازل ہوا:

فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ[18]

تجھ کو حکم دیا گیا، واشگاف کہہ دے۔

اور ارشاد خداوندی ہوا:

وَأَنذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ ۝[19]

اپنے نزدیک کے خاندان والوں کو خدا سے ڈرا۔

قریشِ مکہ کا یہ دستور تھا کہ کسی ہنگامی صورتِ حال سے آگاہی کے لیے وہ کوہِ صفا پر چڑھ کر تمام قبائل کو آواز دیتے تھے اور جب تمام قبائل اکٹھے ہو جاتے تو آواز دینے والا انہیں صورتِ حال سے مطلع کرتا۔ چنانچہ عرب کے دستور کے مطابق آنحضرت ﷺ نے بھی یہی طریقہ اختیار کیا۔ آپ کوہِ صفا پر تشریف لے گئے اور بلند آواز سے پکارا "یا معشرِ قریش" جب لوگ جمع ہو گئے تو آپ ﷺ نے انتہائی حکیمانہ انداز میں سب سے پہلے ان لوگوں سے اپنی صداقت پر گواہی لی۔ آپؐ نے فرمایا: اگر میں تم سے یہ کہوں کہ صفا کی پہاڑی

---

18 الحجر: ۹۴

19 الشعراء: ۲۱۴

کے پیچھے ایک لشکر جرار موجود ہے جو تم حملہ آور ہونے والا ہے تو تم یقین کرلو گے؟ تمام قریش نے بیک آواز کہا، ہاں یقین کریں گے اس لیے کہ ہم نے آپ کی زبان سے کبھی جھوٹ نہیں سنا، اس کے بعد آپ نے قریش کو مخاطب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: "کہ اگر تم ایمان نہ لاؤ گے تو تم پر شدید عذاب نازل ہو گا"۔ یہ سن کر سب لوگ وہاں سے چل دیے اور آپ کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا۔ جب عقل پر پردہ پڑ جائے تو وہ سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت سے محروم ہو جاتی ہے ورنہ قریش کی عقل میں یہ بات آسکتی تھی کہ جو صادق وامین لوگوں کے معاملات میں غلط بیانی سے کام نہیں لیتا وہ خداوند ذوالجلال سے غلط بیان کیونکر منسوب کر سکتا ہے۔

تبلیغی حکمتِ عملی

آپ ﷺ نے خدائی پیغام کو پہنچانے کے لیے ایک اور تدبیر کی۔ حضرت علیؓ کو حکم دیا، دعوت کا اہتمام کرو اور خاندان عبدالمطلب کو مدعو کرو۔ جب تمام لوگ دعوت طعام پر حاضر ہوئے اور کھانے پینے سے فارغ ہو گئے تو آپ نے خطاب فرمانا شروع کیا: "میں وہ چیز لے کر آرہا ہوں جو دین اور دنیا دونوں کی کفیل ہے۔ اس بارِ گراں کو اٹھانے میں کون میرا ساتھ دے گا؟ تمام مجلس میں سناٹا تھا، دفعتاً حضرت علیؓ نے اٹھ کر کہا: "گو مجھ کو آشوب چشم ہے، میری ٹانگیں پتلی ہیں اور میں سب سے کم عمر ہوں، تاہم میں آپؐ کا ساتھ دوں گا"۔

حضرت علیؓ کا یہ معمولی دعویٰ نہ تھا۔ قریش نے ہنسنا شروع کر دیا۔ اُنہوں نے سوچا ہو گا کہ دعویٰ کرنے والا دیکھو اور دعویٰ کی تائید کرنے والا دیکھو، لیکن ان کو تاہ بینوں کو کیا معلوم ہے کہ جن کا معین ومددگار خدائے برتر ہو، انہیں کسی اور کی ضرورت نہیں رہتی۔ اللہ جل شانہٗ مسبب الاسباب ہے، وہ خود حالات کو سازگار بنا دیتا ہے۔ القصّہ آنے والے وقت نے

بتادیا کہ دعویٰ کرنے والا اپنے دعویٰ میں سچا تھا اور دعوے کی تائید کرنے والا بھی عزم و ہمت کا مثالی پیکر تھا۔

تشدّد اور ایذارسانی کا آغاز

حکمت و مصلحت کے تحت ابھی تک نماز چھپ کر پڑھی جارہی تھی۔ آنحضرت ﷺ اور آپ ﷺ کے رفقاء دُور وادیوں اور گھاٹیوں میں چھپ کر عبادت بجا لاتے تھے۔ ایک روز ایک گھاٹی میں سعد بن ابی وقاص دوسرے ساتھیوں کے ساتھ عبادت میں مصروف تھے کہ مشرکینِ مکہ کی نظروں میں آگئے۔ انہوں نے فقرے کسنے شروع کیے۔ طرح طرح کی بولیاں بولیں مگر ادھر سے کوئی جواب نہ ملا، شرمندہ ہو کر کشت و خون پر اتر آئے، نہتے مسلمانوں پر حملہ کردیا اور ایک مشرک کی تلوار سے حضرت سعد بن ابی وقاصؓ زخمی ہوگئے۔ یہ تشدد کا نقطۂ آغاز تھا اور قریش کا طرزِ عمل یہ بتارہا تھا کہ وہ کسی طور پر بھی دینِ اسلام کو برداشت نہیں کریں گے۔ ان کی گھٹیا حرکات سے اندازہ ہورہا تھا کہ وہ اپنے جاہلی عقائد اور جھوٹی آن بان کی خاطر حق و صداقت کی طرف قدم نہیں بڑھائیں گے۔

پہلا شہید

مسلمانوں کی تعداد چالیس کے لگ بھگ تھی، ہر چند کہ قریش کے تیوران کی اندرونی کیفیات کے غماز تھے لیکن اب علانیہ دعوتِ حق کا حکم نازل ہو چکا تھا، اب داعیٔ اسلام اور آپ کے پیروکار ہر خطرے اور مصیبت سے بے نیاز تھے۔ اب حکمِ الٰہی کی تعمیل مقصود تھی۔ چنانچہ سرورِ عالم وعالمیاں ﷺ نے کعبے میں کھڑے ہو کر اعلانِ توحید فرمایا۔ حضور ﷺ کی اس جرأت نے قریش کو سیخ پا کردیا، آپے سے باہر ہوگئے۔ چاروں طرف سے سرورِ عالم ﷺ پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ حارث بن ابیؓ اپنے آقا کی حفاظت کے لیے سامنے آئے، کفار انہیں نشانہ بناتے ہیں اور دیکھتے ہی دیکھتے حارث بن ابیؓ جامِ شہادت نوش

فرمالیتے ہیں اور پہلے شہید کے مرتبۂ جلیلہ پر فائز ہو جاتے ہیں۔

نئی قومیت کی بنیاد

عرب کا وہ معاشرہ جس میں رنگ و نسل اور قبائلی عصبیتیں ہی وجۂ افتخار سمجھی جاتی تھیں، وہاں سرورِ عالم ﷺ نے اعلانِ توحید کے ساتھ ہی ایک نئے نظریۂ قومیت کی بنیاد رکھ دی جو رنگ و نسل، زبان و وطن سے بالاتر نظریہ تھا۔ سرورِ عالم ﷺ نے عرب کے اس ماحول میں کھڑے ہو کر یہ اعلان حق کیا:

يَٰٓأَيُّهَا ٱلنَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَٰكُم مِّن ذَكَرٍ وَأُنثَىٰ وَجَعَلْنَٰكُمْ شُعُوبًا وَقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوٓا۟ ۚ إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ ٱللَّهِ أَتْقَىٰكُمْ ۚ [20]

آپ ﷺ نے انسانی رشتوں میں مادی اور حسی حجاب کا انکار کر دیا، آپ نے فرمایا: تمام انسانوں کی اصل ایک ہے۔ اب اس وحدتِ انسانی میں سے جو لوگ خدائے وحدہ لاشریک پر ایمان لاتے ہیں، رسالت کا اقرار کرتے ہیں، وہ سبھی ایک قوم کے افراد ہیں، اس ایک نظریہ پر یقین رکھنے والوں میں ظاہری کتنی ہی مسافت و دوری کیوں نہ ہو، اللہ جل شانہ انہیں ایک پارٹی، ایک جماعت اور ایک قوم قرار دیتا ہے۔

إِنَّ هَٰذِهِۦٓ أُمَّتُكُمْ أُمَّةً وَٰحِدَةً وَأَنَا۠ رَبُّكُمْ فَٱعْبُدُونِ ۝ [21]

اور اس کے برعکس جو اس نظریہ سے اختلاف کرتے ہیں خدا اور اس کے رسول ﷺ کا انکار کرتے ہیں، اسلام ان میں بھی کسی قسم کی تمیز اور فرق نہیں کرتا بلکہ ان سب کو بھی ایک ہی قوم تصور کرتا ہے۔ سیّد دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اَلْكُفْرُ مِلَّةٌ وَاحِدَةٌ ہر چند کہ ایمان و کفر کی یہ تقسیم سرورِ عالم ﷺ کی بعثت سے پہلے بھی موجود تھی لیکن آپؐ

---

20 الحجرات: ۱۳

21 الانبیاء: ۹۲

سے پہلے مبعوث ہونے والے پیغمبر چونکہ کسی خاص قوم کی طرف مبعوث ہوتے تھے اس لیے ان قومی اور نسلی امتیازات کا کلیۃً خاتمہ نہیں ہو سکا۔ سرورِ عالم ﷺ کی تشریف آوری سے دنیا کی جو تعمیرِ جدید ہوئی اس میں نظریۂ قومیت کو خصوصی اہمیت حاصل ہے، جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے۔ سرورِ عالم ﷺ نے تمام انسانوں کو باعتبارِ قومیت دو گروہوں میں تقسیم کر دیا۔ ایک مومن اور ایک کافر، قرآن مجید میں خالق کائنات ارشاد فرماتا ہے:

هُوَالَّذِیۡ خَلَقَكُمۡ فَمِنۡكُمۡ كَافِرٌ وَّمِنۡكُمۡ مُّؤۡمِنٌ[22]

اور تاریخ کے صفحات گواہی دے رہے ہیں کہ سرورِ عالم ﷺ نے اس نظام کا فقیدُ المثال عملی نمونہ پیش کیا۔ ابو لہب اور ابو جہل آپ کے قریبی عزیز تھے لیکن عقیدہ کے اختلاف کے باعث آپ کی قوم سے الگ ہو گئے، سلمان فارس سے آئے، بلال حبش کے رہنے والے تھے، صہیب رومی تھے لیکن اس مسافت و دوری کے باوجود آپ ﷺ کے ہم عقیدہ ہو کر آپ کی قوم کے فرد بن گئے۔ یہ مختلف علاقوں کے رہنے والے، مختلف رنگوں والے، مختلف زبانیں بولنے والے رشتہ اخوت میں پرو دیے گئے، سرور عالم ﷺ ارشاد فرماتے ہیں: اَلْمُسْلِمُ اَخُوالْمُسْلِم

منجملہ اور باتوں کے سرورِ عالم ﷺ کے اس نظریۂ قومیت نے قریش کے وقار کو بُری طرح دھچکا لگایا، ان کی جھوٹی آن بان کا بُت اسی نسلی اور قومی عصبیت پر قائم تھا۔ اب جبکہ ایک ایسی آواز اٹھ کھڑی ہوئی کہ بحیثیت انسان سب برابر ہیں، نفسِ انسانیت میں غلام و آقا، غریب و امیر، کالے اور گورے میں کوئی تمیز نہیں، یہ ایسا نعرہ تھا جس نے قریش کے غرور کو خاک میں ملا دیا اور ان کے جوشِ انتقام کو مزید بڑھا دیا۔

علامہ اقبالؒ نے اسلامی نظریہ قومیت کی بہت خوبصورت ترجمانی کی ہے۔

---

22 التغابن: ۲

قیاس اپنی ملت کو اقوامِ مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی
ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار
قوت مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تیری

پختگیٔ عزم کا عملی مظاہرہ

رسول اللہ ﷺ کی اعلانیہ تبلیغ سے قریش بھی کھلم کھلا مخالفت پر کمربستہ ہو گئے لیکن خاندانِ بنو ہاشم کے ساتھ ٹکر لینے سے بچنے کے لیے انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ سب سے پہلے آپؐ کے چچا جناب ابوطالب کے پاس جائیں گے اور انہیں ان کے بھتیجے کی فتنہ انگیزیوں سے باخبر کر کے اسے باز رکھنے کے لیے کہیں گے اور اگر وہ باز نہ آئے تو ان سے کہیں گے کہ وہ اس کی پشت پناہی سے دستبردار ہو جائیں، ہم خود ان سے نمٹ لیں گے۔ چنانچہ قریش کے بڑے بڑے سردار جن میں عتبہ، شیبہ، ربیعہ بن عبد شمس بن عبد مناف، ابوسفیان، ابوجہل اور دیگر اعیان قریش بھی ان میں شامل تھے۔ انہوں نے ابوطالب کے پاس جا کر انہیں معاملے کی نزاکت سے آگاہ کیا، انہیں بتایا کہ تمہارا بھتیجا ہمارے بتوں کو جھٹلاتا ہے، ہمارے بڑوں کو بے وقوف قرار دیتا ہے۔ ابوطالب نے حسن تدبر سے انہیں واپس بھیج دیا لیکن کفار مکہ نے جب دیکھا کہ ان کے جانے سے کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہوا اور سرورِ عالم ﷺ کی سرگرمیاں روز بروز بڑھتی چلی جارہی ہیں تو انہوں نے دوبارہ ابوطالب کے پاس جانے کا فیصلہ کیا۔ وہ دوبارہ ابوطالب کے پاس گئے اور انہیں آگاہ کیا کہ ہم زیادہ دیر تک ان حالات کو برداشت نہیں کر سکتے۔ ہم اس حالت میں صبر نہیں کر سکتے کہ ہمارے سامنے ہمارے معبودوں کی تکذیب کی جائے اور ان میں عیب نکالے جائیں۔ ابوطالب کے سامنے جب حالات کا یہ خوفناک نقشہ آیا اور ساتھ ہی ساتھ پوری قوم میں تفریق و انتشار کا

خیال پیدا ہوا تو آپ پریشان ہو گئے، آپ نے سرور عالم ﷺ کو بلایا۔ قریش کی آمد اور ان سے گفتگو کی تفصیل سے آپ کو آگاہ کرنے کے بعد کہا: اے جانِ عم! خود اپنے اوپر بھی رحم کھاؤ اور مجھ پر بھی رحم کھاؤ۔ سرور عالم ﷺ نے جو جواب ارشاد فرمایا وہ عزم وثبات کا نادر نمونہ ہے اور یہ جواب اسی شخص کا ہو سکتا ہے جسے اپنے مقصد پر غیر متزلزل یقین ہو اور یہ مقام صرف نبی اور رسول کا ہو سکتا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

يَا عَمّ وَاللهِ لَوْ وَضَعُوْ الشَّمْسَ فِيْ يَمِيْنِيْ وَالْقَمَرَ فِيْ يَسَارِيْ عَلٰى اَنْ اَتْرُكَ هٰذَا الْاَمْرَ حَتّٰى يُظْهِرَهُ اللهُ اَوْ اَهْلِكُ فِيْ مَا تَرَكْتُهٗ[23]

چچا جان! خدا کی قسم اگر میری دائیں جانب سورج اور بائیں جانب چاند رکھ دیں کہ میں اس معاملے کو چھوڑ دوں، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ خود اس کو غلبہ دے یا میں مر جاؤں تو بھی اسے نہ چھوڑوں گا۔

سرور عالم ﷺ یہ الفاظ ادا کرتے ہوئے شدتِ جذبات سے آبدیدہ ہو گئے اور اُٹھ کھڑے ہوئے۔ جنابِ ابوطالب پر آپ کے جواب نے گہرے اثرات مرتب کیے۔ انہوں نے آپ کو واپس بلایا اور کہا: "جاؤ جو چاہو سو کرو، اللہ کی قسم میں کسی قیمت پر بھی تمہیں ان کے حوالے نہیں کروں گا"۔

کھلم کھلا دشمنی

کفارِ مکہ نے جب دیکھا کہ جنابِ ابوطالب اپنے بھتیجے کی مدد سے کسی قیمت پر دستبردار نہیں ہوں گے تو انہوں نے ایک اور احمقانہ کوشش کی۔ ابوطالب کے پاس حاضر ہوئے اور اپنے ہمراہ ایک خوبصورت اور طاقت ور نوجوان عمارہ بن الوحید بن المغیرہ کو لائے، جنابِ ابوطالب سے کہا کہ یہ طاقتور اور خوبصورت نوجوان آپ کی خدمت میں پیش کرتے

---

23 سیرت ابن ہشام ص ۳۷۶

ہیں، یہ آپ کے پاس رہے گا، اس کے نفع و نقصان کے مالک آپ ہوں گے، اسے آپ اپنے پاس رکھیے اور اس کے بدلے میں اپنا بھتیجا ہمیں دے دیجیے۔ جنابِ ابو طالب نے بہت خوب جواب دیا۔ کہا: ''تم میرے ساتھ کتنا برا معاملہ کر رہے ہو۔ کیا تم اپنا نوجوان اس لیے مجھے دے رہے ہو کہ میں اس کی پرورش کروں اور میرا بھتیجا مجھ سے لے رہے ہو تا کہ تم اسے قتل کر ڈالو۔ واللہ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ اس واقعہ نے قریش کو یقین دلایا کہ ابو طالب کسی صورت محمد (ﷺ) سے علیحدگی اختیار نہیں کریں گے۔ چنانچہ سیرتِ ابن ہشام کے مطابق اس دن سے معاملے نے شدت اختیار کر لی اور کفارِ مکہ مومنوں کو ہر قسم کی ایذا دینے کے لیے کمربستہ ہو گئے۔ اس دن کے بعد جس طرح مسلمانوں کو ظلم و ستم کا نشانہ بنایا گیا اور ان کے صبر و ضبط کا امتحان لیا گیا وہ تاریخِ اسلام کا خونچکاں باب ہے۔ آپ آئندہ صفحات میں ان واقعات کا مطالعہ کریں گے جو کفار کے ظلم و بربریت اور درندگی کی خوفناک مثالیں ہیں لیکن ساتھ ہی ایمان والوں کی جاں نثاری، صبر و ضبط اور یقین و استحکام کی روایات آپ کو ورطۂ حیرت میں مبتلا کر دیں گی۔ ان دینِ اسلام کے پیروکاروں نے جس جرأت ایمانی سے مشکل ترین حالات کا مقابلہ کیا، وہ آج ہمارے لیے ایک سبق کی حیثیت رکھتا ہے۔

دورِ مصائب و آلام

قریش پوری طرح اس بات پر آمادہ ہو گئے کہ اسلام، داعیٔ اسلام اور ان کے اصحاب کو ختم کر کے دم لیں گے۔ انہوں نے اپنے دلوں میں پائے جانے والے جوشِ انتقام کا انتہائی گھناؤنے انداز سے اظہار کیا۔ تہذیب و اخلاق کی تمام حدوں کو پامال کر دیا۔ رسول اللہ ﷺ اور اصحابِ رسول ﷺ کے ساتھ کی جانے والی زیادتیاں بد اخلاقی کی انتہا ہیں۔ غالباً وہ اس زعمِ باطل میں مبتلا تھے کہ شاید اس جور و ستم سے وہ آنے والے انقلاب کے سامنے کوئی بند باندھ سکیں گے یا وہ مینارۂ نور جو فاران کی چوٹیوں سے طلوع ہو چکا تھا، اسے گُل

کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے لیکن انہیں کیا معلوم تھا کہ:

جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ[24]

جب حق نمودار ہوتا ہے تو باطل راہِ فرار اختیار کر لیتا ہے۔

ذیل میں ان واقعات و مصائب کا اجمالاً ذکر کیا جاتا ہے جو ہمارے آقا جناب محمد رسول اللہ ﷺ اور آپ کے اصحاب و صحابیات کو پیش آئے تاکہ دورِ حاضر کے مومن کو معلوم ہو کہ ہمارے رسول ﷺ نے دین کو پھیلانے کے لیے مصائب و آلام کے پہاڑوں کو کس کس طرح سر کیا ہے۔

> منیب غامدی روایت کرتے ہیں کہ "میں نے سرور عالم ﷺ کو دیکھا، لوگوں سے یہ فرماتے تھے: اے لوگو لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہو فلاح پاؤ گے، مگر بعض بدنصیب آپ کو گالیاں دیتے تھے، بعض آپ پر تھوکتے تھے اور بعض آپ پر خاک ڈالتے تھے، اسی طرح دوپہر کا وقت ہو گیا، اس وقت ایک لڑکی پانی لے کر آئی اور آپ کے چہرۂ انور اور دستِ مبارک کو دھویا۔ میں نے دریافت کیا یہ کون ہے؟ لوگوں نے کہا یہ آپ کی صاحبزادی حضرت زینب ہیں[25]۔

غور فرمایئے! محبوب خدا ﷺ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ (نہیں کوئی معبود مگر اللہ) کا نعرہ حق بلند کرتے ہیں۔ ساری دنیا کی غلامی سے آزادی کا پیغام دیتے ہیں تو جواباً گالیاں دی جاتی ہیں، خاک ڈالی جاتی ہے، آپ پر تھوکا جاتا ہے، مگر آپ اس حقارت اور نفرت سے بے نیاز اپنے مشن کی تکمیل کے لیے سرگرم ہیں۔ دورِ حاضر کے مبلغین کے لیے آپ کا طریقہ تبلیغ

---

24 بنی اسرائیل: ۸۱

25 سیرۃ المصطفیٰ ج۱، ص ۱۷۳

مشعل راہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسی اسوۂ حسنہ پر عمل پیرا ہو کر گالیوں کی بوچھاڑ اور نفرتوں کے طوفان میں کلمہ حق بلند کرنا چاہیے۔ گالیاں دینے والوں کی طرف نظر التفات کرنی ہی نہیں چاہیے۔

> بنی کنانہ کے ایک شخص کہتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو بازارِ ذی المجاز میں دیکھا کہ آپ یہ فرمار ہے تھے: اے لوگو لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کہو، فلاح پاؤ گے اور ابو جہل آپؐ پر مٹی پھینکتا تھا اور یہ کہتا تھا کہ اے لوگو تم اس کے دھوکے میں نہ آنا، یہ تم کو لات و عزیٰ سے دور کرنا چاہتا ہے مگر آنحضرت ﷺ اس کی طرف ذرّہ برابر بھی توجہ نہیں فرماتے تھے[26]۔

تبلیغ اسلام کے لیے ہمارے رسول اللہ ﷺ نے جس قدر تکلیفیں برداشت کیں انہیں احاطہ تحریر میں لانا ممکن نہیں ہے۔ حضرت عروہ بن زبیر فرماتے ہیں کہ میں نے ایک بار عبداللہ بن عمرو بن العاص سے کہا کہ مشرکین نے رسول اللہ ﷺ کو جو سخت تکلیف پہنچائی ہو، اس کا ذکر کرو تو عبداللہ بن عمرو العاص نے فرمایا کہ ایک روز رسول اللہ ﷺ حطیم میں نماز ادا فرمارہے تھے کہ عقبہ بن محیط نے آپ کی گردن میں کپڑا ڈال کر اس قدر زور سے کھینچا کہ گلا گھٹنے لگا، سامنے سے ابو بکر آگئے انہوں نے عقبہ کو ایک دھکا دیا اور یہ آیت پڑھی:

> اَتَقْتُلُوْنَ رَجُلًا اَنْ يَّقُوْلَ رَبِّيَ اللّٰهُ وَقَدْ جَآءَكُمْ بِالْبَيِّنٰتِ مِنْ رَّبِّكُمْ[27]
>
> کیا تم ایک مرد کو اس بات پر قتل کرتے ہو کہ وہ یہ کہتا ہے کہ میرا

---

26 مسند احمد جلد ۴، صفحہ ۴۳

27 المؤمن: ۲۸

پروردگار صرف اللہ ہے اوراپنی نبوت ورسالت کے واضح اورروشن دلائل تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے لے کر آیا ہے۔

عبداللہ بن مسعودؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ حرم پاک میں نماز پڑھ رہے تھے ابو جہل اور اس کے حواری بھی وہاں موجود تھے۔ ابو جہل نے کہا کوئی ایسا نہیں جو فلاں اونٹ کی اوجھ اٹھالائے تاکہ محمد ﷺ جب سجدے میں جائیں تو وہ اوجھ ان کی پشت پر رکھ دے۔ اس وقت قوم کا سب سے زیادہ شقی القلب یعنی عقبہ بن ابی معیط اٹھا اور اس نے ایک اوجھ اٹھا کر آپ کی پشت پر ڈال دی، عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ میں یہ منظر دیکھ رہا ہوں اور کچھ نہیں کرپاتا اور مشرکین ہیں کہ ایک دوسرے کو دیکھ کر ہنس رہے ہیں اور ہنسی کے مارے ایک دوسرے پر گر رہے ہیں۔ اتنے میں حضرت فاطمۃ الزہراء جو اس وقت چار پانچ سال کی تھیں، دوڑی ہوئی آئیں اور آپ کی پیٹھ سے اوجھ کو ہٹایا۔ آپ ﷺ نے سجدہ سے سر اٹھایا اور قریش کے لیے تین بار بددعا کی، قریش کو بددعا بہت شاق گزری۔ اس لیے قریش کا یہ عقیدہ تھا کہ اس شہر میں دعا قبول ہوتی ہے۔ اس کے بعد آپؐ نے خاص طور پر ابو جہل، عقبہ بن ربیعۃ، شیبہ بن ربیعہ، ولید بن عقبہ، امیہ بن خلف اور عقبہ بن ابی معیط اور عمارہ بن الولید کے نام لے کر بددعا کی[۲۸]۔

یہ تو تھا وہ سلوک جو آپ ﷺ کی قوم نے آپؐ کے ساتھ روا رکھا اس کے علاوہ انہوں نے ایمان والوں کے ساتھ جو اذیت ناک سلوک کیا وہ بھی کم نہیں بلکہ وحشت و بربریت کی انتہا ہے۔ حضرت بلالؓ کے اسم گرامی نام نامی سے کون واقف نہیں۔ آپ حبشی النسل تھے اور امیہ بن خلف کے غلام تھے۔ دوپہر کی تپتی ہوئی دھوپ میں اپنے غلاموں کو حکم دیتا کہ بلال کو تپتے ہوئے پتھروں پر لٹا کر سینہ پر بھاری پتھر رکھ دیا جائے تاکہ جنبش نہ

---

[28] بخاری شریف ج۱، ص ۴۵۲

کر سکیں اور پھر بلال سے مخاطب ہو کر کہتا، تو اسی حالت میں مر جائے گا، اگر نجات چاہتا ہے تو محمد ﷺ کا انکار کر اور لات و عزیٰ کی پرستش کر لیکن جواب میں بلال کی زبان سے احد۔ احد (اللہ ایک ہے، اللہ ایک ہے) کے سوا کچھ نہ نکلتا[29]۔ ایک روز حضرت بلالؓ کو ظلم و ستم کا نشانہ بنایا جا رہا تھا تو حضرت صدیق اکبرؓ کا گزر ہوا۔ ظلم کے اس منظر نے آپ کو آبدیدہ کر دیا۔ امیہ سے مخاطب ہو کر کہا: اَلَا تَتَّقِی فِیْ ھٰذَ الْمِسْکِیْنِ حَق مَتٰی اَنْتَ (تو اس مسکین کے بارے میں خدا سے نہیں ڈرتا، یہ ظلم و ستم کب تک) امیہ نے جواباً کہا تم لوگ ہی اس کی خرابی کا باعث بنے ہو، اب تم ہی اس کو نجات دلاؤ، حضرت ابو بکرؓ نے فرمایا میرے پاس ایک تنومند غلام ہے اور وہ تمہارے دین پر قائم ہے، تم اسے لے لو اور بلال کو میرے حوالے کر دو۔ امیہ نے حضرت ابو بکرؓ کی اس پیشکش کو قبول کر لیا اور حضرت ابو بکرؓ نے حضرت بلالؓ کو امیہ سے لے کر آزاد کر دیا۔

اصحابِ ایمان میں سے جن لوگوں نے مصائب و آلام کو برداشت کیا، طرح طرح کی اذیتیں سہیں، مگر حق سے سر مُو انحراف نہیں کیا۔ ان میں عمارؓ بن یاسر، صہیبؓ رومی، ابو فکیہہ جُہینی کے اسماء گرامی ہمیشہ سر فہرست اور ظلم کے خلاف سینہ سپر رہنے والوں کے لیے ایک مثال کی صورت میں قائم و دائم رہیں گے۔ حضرت عمار بن یاسرؓ کو کبھی پانی میں غوطے دیے جاتے اور کبھی تپتے ہوئے انگاروں پر لٹایا جاتا ہے اور جب مشفق و مہربان آقا جناب محمد رسول اللہ ﷺ کا وہاں سے گزر ہوتا تو آپ پیار و محبت سے حضرت عمار کے سر پر ہاتھ پھیرتے اور فرماتے:

یَانَارُ کُوْنِیْ بَرْدًا وَّسَلَامًا عَلٰی عَمَّارٍ کَمَا کُنْتَ عَلٰی اِبْرَاھِیْم[30]

---

29 طبقات ابن سعد ج ۳، ص ۱۷۷

30 طبقات ابن سعد، ج ۳، ص ۱۷۷

اے آگ تو عمار کے حق میں ٹھنڈی اور سلامتی والی بن جا جس طرح ابراہیم علیہ السلام پر ٹھنڈی اور سلامتی والی ہو گئی تھی۔

اپنے ایمان کی سلامتی کی خاطر ظلم و ستم سہنے والوں میں صرف مرد ہی نہیں بلکہ ان صحابیات رسول کا مقام بھی کسی صورت میں کم نہیں جنہوں نے اپنی کمزور جانوں پر کئے جانے والے جبر و اکراہ کو برداشت کیا مگر دامنِ اسلام کو ہاتھ سے نہیں چھوٹنے دیا۔ ان پاک صحابیات میں حضرت زنیزہ بھی شامل ہیں۔ آپ حضرت عمرؓ کی کنیز تھیں۔ حضرت عمر ابھی حلقہ بگوشِ اسلام نہیں ہوئے تھے۔ چنانچہ اپنی اس کنیز پر مسلمان ہونے کے سبب بے حد سختی کرتے تھے۔ شدائد و مصائب کی وجہ سے حضرت زنیزہ کی بینائی زائل ہو گئی، لوگوں نے کہنا شروع کیا کہ اس نے لات و عزیٰ کی توہین کی ہے اس لیے اس کی بینائی جاتی رہی۔ یہ سن کر ان کو بہت تکلیف ہوتی تھی۔ خداوند عزوجل نے اپنے فضل عظیم سے ان کی بینائی لوٹا دی[31]۔

الغرض حضرت عثمانؓ اور حضرت زبیرؓ پر ان کے چچاؤں کی زیادتیاں، حضرت عمرؓ کا اپنے بہنوئی پر ظلم و تشدد، حضرت ابوذر غفاری پر حرمِ پاک میں مشرکین کا حملہ، یہ تمام واقعات داستانِ ظلم کی ایک معمولی سی جھلک ہیں، وگرنہ کفار کے ظلم اور صحابہؓ کے صبر سے متعلق واقعات اتنی کثرت سے ہیں کہ ایک ضخیم کتاب مرتب کی جاسکتی ہے۔

حضرت حمزہؓ کا قبولِ اسلام

سیرت رسولؐ کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ ابوجہل وہ بدبخت شخص تھا جو کوئی موقع ضائع کیے بغیر سرور عالم ﷺ کو دکھ پہنچاتا تھا۔ جہاں رسول اللہ ﷺ نظر آتے، کوئی نہ

---

31 زرقانی، ج ۱، ص ۲۶۹

کوئی ایسی حرکت ضرور کرتا جس سے رسول اللہ ﷺ کو اذیت پہنچتی۔ اس طرح ایک دن یہ واقعہ پیش آیا کہ سرورِ عالم ﷺ کوہِ صفا کے قریب تشریف فرما تھے۔ ابو جہل وہاں پہنچ گیا۔ اس نے موقع پاکر آپ کو برا بھلا کہا۔ سرورِ عالم ﷺ نے جواب میں خاموشی اختیار فرمائی کیونکہ بے ہودہ باتوں کے جواب میں خاموش رہنا ہی آپ کا اصول اور معمول تھا۔ اتفاق سے یہ تمام باتیں جو ابو جہل نے حضور ﷺ سے کہی تھیں، عبد اللہ بن جدعان بن عمرو بن کعب بن تیم بن مرہ کی ایک لونڈی سن رہی تھی۔ تھوڑی ہی دیر بعد حضرت حمزہ شکار سے فارغ ہونے کے بعد اپنی کمان گلے میں ڈالے وہاں سے گزرے۔ اس لونڈی نے تمام قصہ حضرت حمزہ کو کہہ کر سنایا، حضرت حمزہ یوں بھی سخت طبیعت کے مالک تھے، اپنے بھتیجے کے ساتھ زیادتی کا یہ قصہ سن کر بہت غصے میں آئے، سیدھے خانہ کعبہ پہنچے، دیکھا کہ دوسرے لوگوں کے ساتھ ابو جہل وہاں موجود ہے، اپ اس کے سر پر جا کھڑے ہوئے اور کمان اس زور سے اس کے سر پر ماری کہ خون بہنے لگا، ساتھ ہی آپ نے ابو جہل سے مخاطب ہو کر کہا، کہ تو انہیں گالیاں دیتا ہے، لے میں بھی انہی کے دین پر ہوں، میں بھی وہی کہتا ہوں جو وہ کہتے ہیں، تجھ سے ہو سکے تو وہی برتاؤ مجھ سے بھی کر"[32]۔ چنانچہ اسی دن حضرت حمزہ نے تائیدِ حق اور نصرتِ دین کا اعلان کیا اور یوں اصحابِ رسولؐ کے پاکیزہ گروہ میں شامل ہو گئے۔

ہجرتِ حبشہ

ہجرت کے لفظی معنی انتقال مکان کے ہیں۔ اسلامی تاریخ میں یہ اصطلاح ان لوگوں کے انتقال مکانی کے لیے استعمال ہوتی ہے جنہوں نے کفار کے مظالم سے تنگ آکر اپنے دین و ایمان کی حفاظت کی خاطر اپنے وطن، مال و اولاد اور آباؤ اجداد کو خیر باد کہہ

---

32 زرقانی ج ۱، ص ۲۶۹

دیا۔ ہجرت کے یہ واقعات تین مرتبہ پیش آئے، دو مرتبہ اصحاب رسول ﷺ نے حبشہ کی جانب ہجرت فرمائی اور ایک مرتبہ صحابہ نے یثرب (مدینۃ النبی) کی طرف ہجرت فرمائی۔ مؤخر الذکر ہجرت میں سرور عالم بھی شامل تھے۔ ان صفحات میں اوّل الذکر دو ہجرتوں کا ذکر کیا جائے گا۔ کفار مکہ نے جب ظلم و ستم کی انتہا کر دی اور آپ ﷺ نے اپنے جان نثاروں کو تشدّد کا تختۂ مشق بنے دیکھا تو آپؐ نے اپنے اصحاب کو اپنے آبائی وطن کو خیر باد کہنے کی اجازت مرحمت فرمائی۔ آپ نے ارشاد فرمایا:

تَفَرَّقُوْا فِیْ الْاَرْضِ فَاِنَّ اللهَ سَیَجْمَعُکُمْ قَالُوْ اِلٰی اَیْنَ نَذْهَبُ قَالَ اِلٰی هنَا وَاَشَارَ بِیَدِهٖ اِلٰی اَرْضِ الْحَبْشَه[33]

تم اللہ کی زمین پر کہیں چلے جاؤ، یقیناً اللہ تعالیٰ تم سب کو عنقریب جمع کرے گا، صحابہ نے عرض کیا کہاں چلے جائیں؟ آپ نے ملکِ حبشہ کی طرف اشارہ فرمایا۔

سیرت ابن ہشام کے مصنف نے لکھا آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

لَوْ خَرَجْتُمْ اِلٰی اَرْضِ الْحَبْشَةِ فَاِنَّ بِهَا مَلِکاً لَا یُظْلِمُ عِنْدَهٗ اَحَد وَهِیَ اَرْضُ صِدْقٍ حَتّٰی تَجْعَلَ اللهُ لَکُمْ خَرْجاً مِمَّا اَنْتُمْ فِیْهِ[34]

اگر تم لوگ سرزمینِ حبشہ کو چلے جاؤ (تو بہتر ہو) کہ وہاں کا بادشاہ کسی پر ظلم نہیں کرتا اور وہ سچائی والی زمین ہے، یہاں تک کہ اللہ تمہارے لیے ان آفتوں سے نکلنے کی جن میں تم مبتلا ہو کوئی بہتر صورت پیدا کر دے۔

---

33 سیرت المصطفیٰ، ادریس کاندھلوی ج ۱، ص ۲۰۶

34 سیرت ابن ہشام، جلد ۱، ص ۴۸۵

اس اجازت کے بعد آپ کے صحابہ نے ایمان کی سلامتی کی خاطر اپنے عزیز ترین رشتوں کو قربان کر کے حبشہ کی جانب ہجرت کی۔ یہ ہجرت جس کو دورِ اسلام کی سب سے پہلی ہجرت کہا جاتا ہے۔ اس میں گیارہ مرد اور چار عورتوں نے ہجرت کی۔ ان میں حضرت عثمان اور ان کی اہلیہ محترمہ حضرت رقیہ بنت رسول اللہ ﷺ بھی شامل تھیں۔ مہاجرین کرام کی یہ جماعت قریباً تین ماہ حبشہ میں مقیم رہی اور یہ عرصہ نہایت امن وامان سے گزرا۔ ماہِ شوال میں ان کو یہ خبر ملی کہ اہلِ مکہ حلقۂ اسلام میں داخل ہو گئے ہیں۔ چنانچہ ان میں سے اکثر واپس گھر روانہ ہو گئے۔ مکہ آ کر انہیں معلوم ہوا کہ کفارِ مکہ کے مسلمان ہونے کی خبر جھوٹی تھی۔

حبشہ کی جانب دوسری ہجرت

مسلمانوں کی حبشہ سے واپسی پر کفار کے ظلم وستم وتشدد کی رفتار میں مزید تیزی آ گئی۔ پہلے سے بھی زیادہ بربریت کے مظاہرے شروع ہو گئے۔ چنانچہ سرورِ عالم ﷺ نے دوبارہ حبشہ کی جانب جانے کے لیے ہجرت کی اجازت مرحمت فرمائی۔ اس مرتبہ مہاجرین کی کل تعداد تقریباً ۱۰۲ تھی، جن میں ۸۵ مرد اور ۱۷ عورتیں شامل تھیں۔ حبشہ میں مسلمانوں کو امن وامان سے فرائض کی بجا آوری کا موقع ملا اور مطمئن زندگی گزارنے لگے۔ قریش بھی خاموش بیٹھنے والے نہیں تھے۔ انہوں نے عمرو بن العاص اور عبداللہ بن ربیعہ پر مشتمل دو رکنی وفد کو تحائف کے ساتھ نجاشی کے پاس بھیجا۔ یہ دونوں حبشہ پہنچے۔ عمائدینِ سلطنت میں سے ہر ایک سے ملے، قیمتی تحائف ان کی خدمت میں پیش کیے اور انہیں یہ بتایا کہ ہمارے شہر کے چند نادانوں نے اپنا دین چھوڑ دیا اور ایک نیا دین اختیار کر لیا، عیسائی حکومت کے عمائدین کو اپنا ہم خیال بنانے کے لیے یہ بھی کہا کہ انہوں نے ہمارا دین ترک کرنے کے بعد تمہارا دین بھی اختیار نہیں کیا یعنی مذہب عیسائیت اختیار نہیں کیا۔ انہوں نے عمائدین

حکومت سے بادشاہ کے حضور سفارش کی درخواست کی کہ وہ ان نوجوانوں سے بغیر گفتگو اور دریافتِ احوال ملک بدر کردے اور ہمارے حوالے کردے۔ چنانچہ یہ لوگ جب بادشاہ کے سامنے پیش ہوئے اور انہوں نے اپنا مدعا بیان کیا تو تمام عمائدینِ حکومت نے ان کی پرزور سفارش کی مگر نجاشی جو کہ فطرت سلیم کا مالک تھا، غصے میں آگیا اور اس نے کہا کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ میں دوسرے فریق سے اصلاح احوال دریافت کیے بغیر فیصلہ صادر کردوں۔

بادشاہ نے ایک آدمی صحابہ کو بلانے کے لیے بھیجا۔ صحابہ کرامؓ کو جب یہ اطلاع ملی تو باہم غور و فکر کیا کہ ہم مسلمان ہیں، بادشاہ عیسائی ہے، ہمارے اور اس کے درمیان بہت سے عقائد کا اختلاف ہے، تفکر کے بعد صحابہ نے یہ فیصلہ کیا کہ ہم وہی کہیں گے جو ہمارے اللہ اور ہمارے رسول ﷺ نے ہمیں بتایا ہے۔ صحابہ کرام دربار میں حاضر ہوئے اور توحید کا اعلیٰ وارفع نمونہ پیش کیا۔ آپ نے بادشاہ کے سامنے رسمِ سجدہ ادا نہیں کی اور صرف سلام پر اکتفا کیا۔ مسلمانوں کا یہ طرزِ عمل تمام عمائدین سلطنت کے لیے غصہ کا موجب بنا اور بادشاہ نے صحابہ سے پوچھا کہ تم نے سجدہ کیوں نہیں کیا۔ صحابہ نے بھرے دربار میں حق کی آواز بلند کی۔ حضرت جعفرؓ نے صحابہ کے ترجمان کی حیثیت سے جواب دیا کہ ہم اللہ کے سوا کسی کو سجدہ نہیں کرتے۔ اللہ نے ہماری جانب ایک رسول بھیجا ہے جس نے ہم کو یہی تعلیم دی۔ مقام غور و فکر ہے کہ ایک خدا کے حضور سر تسلیم خم کرنے والے کس طرح ساری دنیا سے بے نیاز ہو جاتے ہیں۔ دیارِ غیر میں دشمنوں کے درمیان کھڑے ہو کر کس طرح حق و صداقت کا علم بلند کرتے ہیں۔ علامہ اقبال علیہ الرحمۃ اسی حقیقت کی جانب اشارہ فرماتے ہیں:

وہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات

دینِ متین کے متعلق دریافت کرنے پر نجاشی کے دربار میں حضرت جعفرؓ نے

نہایت ہی مؤثر اور پر مغز تقریر کی۔ آپؐ نے فرمایا:

اے بادشاہ! ہم سب جاہل اور نادان تھے، بتوں کو پوجتے اور مردار کھاتے تھے۔ قِسم قِسم کی برائیوں میں مبتلا تھے، ہم قرابتوں کو قطع کرتے اور پڑوسیوں کے ساتھ بدسلوکی کرتے تھے، ہم میں سے زبردست یہ چاہتا کہ کمزور کو نگل جائے۔ ہم اسی حالت میں تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ہم پر اپنا فضل فرمایا اور ہم میں ایک پیغمبر بھیجا جس کے حسب و نسب، صدق وامانت، پاک دامنی اور عفت کو ہم خوب پہچانتے ہیں۔ اس نے ہم کو اللہ کی طرف بلایا کہ ہم اسے ایک مانیں، ایک جانیں اور ایک سمجھیں، صرف اسی کی عبادت بجالائیں اور جن بتوں اور پتھروں کی پرستش ہمارے اباؤ اجداد کرتے تھے ان کو فی الفور چھوڑ دیں۔ سچائی، امانت، صلہ رحمی، پڑوسیوں سے حسن سلوک کا حکم دیا، خونریزی اور حرام باتوں سے منع فرمایا، تمام بے حیائیوں سے، ناحق گفتگو سے، یتیم کا مال کھانے سے، کسی پاک دامن عورتؔ پر تہمت لگانے سے منع کیا اور یہ حکم دیا کہ صرف اللہ کی عبادت کریں، کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہرائیں، نماز پڑھیں، روزہ رکھیں، غرض یہ کہ جان ومال کو خدا کی راہ میں قربان کرنے سے دریغ نہ کریں ---

پس ہم نے ان کی تصدیق کی، ان پر ایمان لائے اور جو کچھ اللہ کی طرف سے لے کر وہ آئے اس کا اتباع اور پیروی کی۔ چنانچہ ہم صرف اللہ کی عبادت کرتے ہیں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہراتے، حلال کام کرتے ہیں اور حرام سے بچتے ہیں، یہ ہیں وہ وجوہ جن کی بنا پر ہماری قوم نے ہم کو طرح طرح سے ستایا اور قسم قسم کی

اذیتیں پہنچائیں تاکہ ہم ایک اللہ کی عبادت کو چھوڑ کر پھر سے بُت
پرستی میں، اور اخلاقِ حسنہ کو چھوڑ کر گزشتہ بے حیائیوں میں مبتلا
ہو جائیں۔ جب ہم ان کے مظالم سے تنگ آگئے، اپنے دین پر قائم
رہنا، ایک خدا کی عبادت دشوار ہو گئی، تب ہم نے اپنا وطن چھوڑا اور
اس امید کے ساتھ کہ آپ ظلم نہیں کریں گے، آپ کی ہمسائیگی کو
سب پر ترجیح دی۔

حضرت جعفرؓ کی تقریرِ دلپذیر سننے کے بعد نجاشی نے کہا کہ کلام الٰہی میں سے تمہیں کچھ یاد ہے۔ حضرت جعفرؓ نے فرمایا ہاں۔ نجاشی نے سننے کی خواہش ظاہر کی اور حضرت جعفرؓ نے سورۂ مریم کا ابتدائی حصہ پڑھ کر سنایا۔ تلاوتِ کلام پاک کے دوران نجاشی اور عمائدینِ سلطنت پر بہت رقت آمیز کیفیت طاری رہی اور ان کی آنکھوں سے آنسو رواں رہے حتیٰ کہ ان کی داڑھیاں تربتر ہو گئیں۔ تلاوتِ کلام پاک کی سماعت سے اس کی حقانیت اور منجانب اللہ ہونے پر یقین محکم ہو گیا اور اس کا اظہار اس نے ان الفاظ میں کیا:

یہ کلام اور وہ کلام جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام لے کر آئے دونوں ایک
ہی شمعدان سے نکلے ہوئے ہیں۔ اور قریش کے وفد کو پرزور الفاظ
میں کہہ دیا کہ " میں ان لوگوں کو ہرگز تمہارے سپرد نہیں کروں
گا"۔

قریش کے وفد نے بادشاہ کو مسلمانوں سے بدظن کرنے کے لیے یہ بات بھی اس کو پہنچائی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق مسلمانوں کا وہ عقیدہ نہیں جو تمہارا ہے۔ بادشاہ نے اس کے لیے بھی جب مسلمانوں سے پوچھا تو حسبِ سابق حضرت جعفرؓ نے صحابہ کی نمائندگی کرتے ہوئے جواب دیا کہ ہمارے نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے بندے اور رسول تھے اور خدا کی خاص روح اور خدا کا خاص کلمہ تھے۔ نجاشی

نے یہ سن کر زمین سے ایک تنکا اٹھایا اور کہا کہ خدا کی قسم حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس سے تنکے کی مقدار بھی زائد نہیں۔ چنانچہ قریش کے وفد کی تمام کوششیں رایگاں گئیں، نجاشی نے ان کے تمام تحائف واپس کر دیے اور مسلمانوں کو ان کے حوالے کرنے سے انکار کر دیا۔

یہ تھی وہ پہلی ہجرت جو اصحابِ رسول ﷺ نے کی اور دنیا والوں کو یہ سبق دیا کہ اگر وطن اور وطن کے رہنے والے دین کی راہ میں حائل ہوں تو دین کی خاطر اللہ اور اس کے رسول کی رضا و خوشنودی کے لیے ان سب کو چھوڑا جا سکتا ہے کیونکہ ہماری جمعیت اور بقاء کا انحصار صرف اور صرف دین پر ہے۔ دین کے لیے دنیا و مافیہا کو قربان کیا جا سکتا ہے۔

عمر، فاروقِ اعظمؓ بن گئے

سرورِ عالم ﷺ نے بارگاہِ رب العزت میں یہ دعا فرمائی اے اللہ، عمر بن ہشام اور عمر بن الخطاب میں سے جو تیرے نزدیک زیادہ محبوب ہے، اسی سے اسلام کو عزت دے۔ اور ایک روایت میں خاص طور پر صرف حضرت عمرؓ کے لیے آنحضرت ﷺ کی دعا مذکور ہے، جیسا کہ تاریخ کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ حضرت عمر فاروق قبول اسلام سے پہلے اسلام دشمنی میں کسی بھی دشمنِ اسلام سے پیچھے نہ تھے لیکن محبوب خدا ﷺ کی دعا کو قبولیت کی خلعت سے نوازا جا چکا تھا، عمر کی قسمت پلٹا کھا رہی تھی اور اچانک ایک دن ایک ہی واقعہ نے عمر کو دشمنانِ اسلام کی صفوں سے نکال کر جان نثاراں اسلام کی صف میں لا کھڑا کیا، ہوا یوں کہ دشمن اسلام ابو جہل نے اعلان کیا کہ جو محمد (ﷺ) کو قتل کرے گا میں اسے انعام میں سو اونٹ دوں گا۔ حضرت عمر نے ابو جہل کے پاس جا کر اس اعلان کی تصدیق کی اور اس کے بعد تلوار ہاتھ میں لیے سرورِ عالم ﷺ کو (نعوذ باللہ) جان سے مار ڈالنے کے ارادے سے نکلے۔ سرراہ ان کی ملاقات اپنے خاندان کے ایک فرد نعیم بن عبد اللہ سے

ہو گئی۔ حضرت عمر کے تیور دیکھ کر نعیم نے پوچھا، عمر کہاں جا رہے ہو؟ جواب میں کہا "محمد (ﷺ) کو قتل کرنے کے لیے"۔ نعیم بن عبداللہ نے کہا محمد (ﷺ) کو قتل کر کے بنی ہاشم اور بنی زہرہ سے کس طرح بچ سکو گے۔ عمر نے کہا، مجھے معلوم ہوتا ہے تم بھی اپنا دین چھوڑ چکے ہو، نعیم نے کہا مجھے چھوڑو۔ اپنی بہن اور بہنوئی کی خبر لو وہ تو اسلام قبول کر چکے ہیں۔ یہ سن کر حضرت عمر کے غصے کی انتہا نہ رہی۔ انتہائی غیض و غضب کی حالت میں اپنی بہن کے گھر پہنچے، پاؤں کی آہٹ سنتے ہی حضرت خباب چھپ گئے اور بہن نے کلام مجید کے اوراق چھپا دیے۔ مگر حضرت عمر تعلیم قرآن کی آواز سن چکے تھے، اپنے بہنوئی سے دست و گریبان ہو گئے، بہن نے بیچ بچاؤ کی کوشش کی تو وہ بھی ان کے جوشِ غضب کا نشانہ بن گئی، شدید زخمی ہو گئیں اور خون بہنے لگا۔ اسی اثنا میں ان کی بہن کے منہ سے یہ کلمہ نکلا کہ عمر جو چاہو کرو، ہم تو مسلمان ہو چکے ہیں۔ یہ الفاظ انہوں نے اس یقین سے سرشار ہو کر کہے کہ حضرت عمرؓ کے دل کی دنیا کو بدل دیا۔ حضرت عمر سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ یہ کیسا دین ہے کہ جس کے پیروکار جب ایک مرتبہ اس کو قبول کر لیتے ہیں تو دنیا کا کوئی لالچ اور خوف انہیں اپنے دین سے دور نہیں کر سکتا۔ چنانچہ انہوں نے اپنی بہن سے کہا کہ مجھے وہ کلام سناؤ جو تم پڑھ رہی تھیں۔ آپ کی بہن کے کہنے پر آپ نے وضو کیا اور تلاوت کلام پاک شروع کی۔ قرآن کا ایک ایک لفظ حضرت عمرؓ کے رگ و پے میں سرایت کر رہا تھا۔ ہر لحظہ حضرت عمرؓ کے دل و دماغ میں دھماکے ہو رہے تھے حتیٰ کہ جب قرآن مجید کی اس آیت پر پہنچے:

إِنَّنِيٓ أَنَا ٱللَّهُ لَآ إِلَٰهَ إِلَّآ أَنَا۠ فَٱعۡبُدۡنِي وَأَقِمِ ٱلصَّلَوٰةَ لِذِكۡرِيٓ ۝[35]

میں ہی معبود برحق ہوں، میرے سوا کوئی معبود برحق نہیں، پس میری ہی عبادت کرو اور نماز کو میری یاد کے لیے قائم کرو۔

---

35 طٰہٰ: ۱۴

بے ساختہ عمر پکار اٹھے:

مَآ اَحْسَنُ هٰذَا الْكَلَامُ وَاَكْرَمُه

کیا ہی اچھا اور بزرگ کلام ہے۔

حضرت خبابؓ کے ہمراہ حضرت عمرؓ دارارقم میں بارگاہ رسالت مآب ﷺ میں حاضر ہوئے اور دولت ایمان سے مالا مال ہوئے اور سرورِ عالم ﷺ نے آپ کا نام ''فاروق'' رکھا[36]۔ حضرت فاروق اعظم اس وقت عمرؓ کے ستائیسویں سال میں تھے اور آفتاب رسالت کو طلوع ہوئے چھٹا سال گزر رہا تھا۔ حضرت عمر کے ایمان لانے سے پہلے مسلمان کعبۃ اللہ میں نماز ادا نہیں کرتے تھے۔ حضرت عبد اللہؓ بن مسعود کی روایت کے مطابق حضرت عمرؓ کے اسلام لانے کے بعد حضرت عمرؓ کے ساتھ مسلمانوں نے خانہ کعبہ میں نماز ادا فرمائی۔

رسول خدا ﷺ شعبِ ابی طالب میں

نجاشی کا مسلمانوں کے ساتھ حسنِ سلوک، حضرت عمرؓ اور حضرت حمزہؓ کا قبولِ اسلام، ان تمام واقعات نے قریش کی آتشِ غضب کو اور بھڑکا دیا اور انہوں نے ایک معاہدہ کیا کہ حضرت محمد ﷺ، بنی ہاشم اور ان کے تمام حامیوں سے ہر قسم کے تعلقات منقطع کر لیے جائیں، کوئی رشتہ کا لین دین نہ ہو، کوئی میل ملاپ نہ ہو اور یہ کیفیت اس وقت تک قائم رہے گی جب تک بنو ہاشم حصرت محمد (ﷺ) کو ہمارے حوالے نہ کر دیں۔ اس تحریر کو کعبۃ اللہ میں آویزاں کر دیا گیا، ابو طالب اپنے تمام خاندان سمیت شعب (درّہ) ابو طالب میں تشریف لے گئے۔ اس صورتِ حال میں مسلمانوں کے علاوہ بنو ہاشم کے دوسرے افراد نے بھی نسبی تعلق کی بنیاد پر آنحضرت ﷺ کا ساتھ دیا۔ اس حصار کی ابتداے نبوی میں

---

36 طبقات ابن سعد جلد ۳، ص ۱۹۴

ہوئی اور ۱۰ نبوی میں یہ مصیبت کا دور اختتام کو پہنچا۔ گویا تین سال تک آپ کفار مکہ کے انتقام کا نشانہ بنے رہے۔ اس دوران آپ اور آپ کے اصحاب اور دیگر محصورین نے انتہائی مشکل وقت گزارا۔ درختوں کے پتے کھائے، اونٹ کی کھال کو جلا کر سفوف بنایا اور اسے پانی کے ساتھ کھا کر گزارہ کیا، کئی کئی دن فاقے میں گزارے، بچوں کی چیخ و پکار کے صبر آزما لمحات سے گزرنا پڑا۔ سعد بن ابی وقاص فرماتے ہیں کہ میں فاقے کی حالت میں تھا، اتفاق سے ایک رات میرا پاؤں کسی چیز کے ساتھ مس ہوا۔ یہ دیکھے اور جانے بغیر کہ یہ کیا چیز ہے میں نے اسے زبان پر رکھا اور نگل گیا۔ اب تک معلوم نہیں کہ وہ کیا چیز تھی۔ کفار مکہ میں بھی بعض لوگ ایسے موجود تھے جنہیں اپنے اعزہ کے ساتھ کیا جانے والا سلوک بہت برا لگتا تھا چنانچہ ہشام بن عمرو کی تحریک پر پانچ آدمی (ہشام بن عمرو، زبیر بن ابی امیہ، مطعم بن عدی، ابوالبختری اور زمعہ بن الاسود۔ اس معاہدے کو چاک کرنے پر متفق ہوگئے، دوسرے دن انہوں نے اس معاملہ پر قریش کے ساتھ خوب بحث و تمحیص کی جس کے نتیجے میں ابو جہل ناراض ہو کر مجلس سے اٹھ کر چلا گیا، ادھر قریش میں باہم یہ معاملہ جاری تھا، ادھر سرور عالم ﷺ نے جناب ابوطالب کو یہ خبر دی کہ اس عہد نامہ کو دیمک چاٹ چکی ہے اور صرف بِاسْمِکَ اللّٰھُمَّ کے الفاظ باقی ہیں۔ جناب ابوطالب نے پورے یقین کے ساتھ قریش کو یہ بات بتائی کہ میرے بھتیجے نے یہ خبر مجھے دی ہے، تم اس صحیفہ کو منگوا کر تصدیق کرلو، اگر خبر درست ہو تو معاہدہ ختم کردو اور اگر خبر غلط ثابت ہوئی تو میں اپنے بھتیجے کو تمہارے حوالے کردوں گا۔ چنانچہ صحیفہ منگوایا گیا اور قریش نے جب اپنی آنکھوں سے مخبر صادق کی دی ہوئی خبر کو حرف بحرف درست دیکھا تو شرمندگی سے آنکھیں جھک گئیں اور یوں یہ ظالمانہ معاہدہ اپنے انجام کو پہنچا۔

صدیق اکبر کی تلاوت کلام پاک

مکہ کے ماحول میں جو گھٹن اور مسلمانوں کے لیے جو مشکلات پیدا ہوئی تھیں، گزشتہ صفحات کے مطالعہ سے ہر شخص اندازہ کرسکتا ہے، سرورِ عالم ﷺ کے سفر و حضر کے ساتھی جناب صدیق اکبرؓ نے بھی مکہ کے حالات سے مایوس ہو کر حبشہ کی جانب ہجرت کا ارادہ کیا اور روانہ ہوگئے۔ راستے میں ابن الدغنہ سے ملاقات ہوئی، اس کے استفسار پر آپؓ نے وطن چھوڑنے کا قصہ سنایا، ابن الدغنہ نے حضرت صدیق اکبرؓ کے پاکیزہ خصائص کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ تم ناداروں کے مددگار ہو، صلہ رحمی کرتے ہو، مہمان نواز ہو وغیرہ وغیرہ۔ اس کے بعد ابن الدغنہ نے حضرت صدیق اکبرؓ سے کہا کہ میں آپ کو اپنی پناہ میں لیتا ہوں، چنانچہ آپ واپس چلیے۔ حضرت صدیق اکبرؓ واپس آگئے اور ابن الدغنہ نے کعبۃ اللہ میں اعلان کردیا کہ میں نے ابو بکر کو پناہ دی ہے، حضرت ابو بکر اپنے گھر میں عبادت بجالاتے تھے اور تلاوت کلام اللہ فرماتے تھے، رفیقِ ہجرت جناب صدیق اکبرؓ اس وقت ایسے جذب و کیف سے معمور آواز میں تلاوت فرماتے کہ دلوں کے دریچے کھل جاتے تھے، جس کے کانوں میں آواز پڑتی اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ جاتی، کیوں نہ ہو، کلام خدا کا اور زبان صدیق کی۔

جب جناب صدیق اکبر تلاوت فرماتے تو قریش کی خواتین بچے وغیرہ سبھی جمع ہوجاتے اور تلاوتِ صدیقی سے لطیف اندوز ہوتے، کفارِ مکہ نے جب یہ حال دیکھا تو سخت پریشان ہوگئے۔ وہ قرآن سننے کے اثرات سے بخوبی واقف تھے، سوچا اگر یہ سلسلہ جاری رہا تو ممکن نہیں کہ سننے والوں کے دل قرآنی اثرات کو قبول نہ کریں۔ چنانچہ سب ابن الدغنہ کے پاس گئے، سارا ماجرا بیان کیا اور فریاد کی کہ اگر صدیق یوں ہی تلاوت کرتے رہے تو ہمیں اپنے بچوں اور عورتوں کے بگڑنے کا اندیشہ ہے۔ صدیق اکبرؓ کو حالات کا علم ہوا تو

آپؐ نے پناہ واپس کر دی۔

غم کا سال

نبوت کا دسواں سال تھا کہ سرورِ عالم ﷺ کو دو صدمے برداشت کرنے پڑے۔ اس سال آپ کے مشفق و مہربان چچا جنابِ ابو طالب آپ سے رخصت ہو کر عالم بقا کی طرف روانہ ہو گئے اور چند ہی روز بعد آپ کی رفیقۂ حیات اُم المؤمنین حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ بھی انتقال فرما گئیں۔ چونکہ اس سال سرورِ عالم ﷺ کو دو دکھ برداشت کرنے پڑے۔ اس لیے اس سال کو "عام الحـــزن" (رنج و غم کا سال) کا نام دیا گیا۔

رحمت و رأفت کا بے مثال مظاہرہ

مکہ والوں نے رسول خدا ﷺ کو اس قدر ستایا کہ آپ ﷺ مکہ والوں سے مایوس ہو گئے۔ آپ نے محسوس کیا کہ مکہ والوں کے دل بنجر زمین کی مانند ہیں جس کی سرسبزی و شادابی کی توقع سعیِ لاحاصل ہے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے طائف جانے کا ارادہ کیا جہاں پر تین سرداروں (عبدیالیل، مسعود، حبیب) کی سرداری قائم تھی۔ آپ تبلیغِ حق کے لیے ان کے پاس پہنچے اور کلمۂ حق پیش فرمایا لیکن تینوں بدقسمت سرداروں نے نبی اعظم ﷺ کی عزت و توقیر کے بجائے آپ کے ساتھ مذاق کیا، آپ کی بات سننے سے انکار کر دیا، آپ کو طائف سے باہر نکال دیا اور بازاری لڑکوں کو حکم دیا کہ وہ آپ پر آوازیں کسیں، ستائیں اور آپ پر پتھر برسائیں۔ الغرض اس چشمِ فلک پیر نے انتہائی حسرت ناک نظروں سے منظر دیکھا کہ داعیٔ حق اپنے جان نثار زید بن حارثہ کے ہمراہ بازارِ طائف سے نکل رہے ہیں، پتھروں کی بارش ہو رہی ہے اور جان نثارِ مصطفیٰ زید بن حارثہؓ ڈھال کی طرح پتھروں کو روک رہے ہیں، اس کوشش میں ہیں کہ پتھر مجھے لگے اور رسولِ خدا تک نہ پہنچ سکے۔ لیکن پھر بھی رسول خدا ﷺ کے زخموں سے خون رسنے لگا، نعلینِ مبارک خون

سے تر ہو گئے۔ یہ منظر ایسا ہے کہ آج بھی جب تاریخ کے طالب علموں کی نظروں سے یہ صفحات گزرتے ہیں تو آنکھیں نمناک ہو جاتی ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ رسول خدا کے اسوۂ حسنہ سے مستقل مزاجی، مشن کی تکمیل کے لیے سرگرمیٔ عمل کا اسے وہ سبق ملتا ہے جو شاید کوئی اور مصلح پیش نہ کر سکا۔ مصیبت پر صبر کرنا یہ بھی کوئی معمولی کام نہیں لیکن رسولِ خدا ﷺ کے حضور جبریل امین، ملک الجبال (پہاڑوں کا فرشتہ) کے ہمراہ حاضر ہوتے ہیں اور آپ سے اجازت چاہتے ہیں کہ ان گستاخانِ رسول کو اس بے ہودگی کا مزہ چکھائیں۔ ملک الجبال نے عرض کیا کہ اگر مجھے اجازت ہو تو میں پہاڑوں کو ان پر الٹ دوں لیکن نبی اعظم کی نگاہِ دور بیں مستقبل کے ان درخشندہ مسلمانوں کو دیکھ رہی تھی جو طائف والوں کی نسل سے پیدا ہونے والے تھے۔ آپ ﷺ نے عفوو درگزر اور رحمت و رأفت کا عظیم مظاہرہ فرمایا، فرشتوں کی پیشکش کے جواب میں آپ نے ارشاد فرمایا: ”نہیں بلکہ میں امید کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ان کی پشتوں سے ایسے بندے پیدا کرے گا جو صرف اللہ کی عبادت کریں گے اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں گے“[37]۔

آپ ﷺ مکہ میں دوبارہ مطعم بن عدی کی پناہ میں داخل ہوئے، طبقات ابن سعد میں ہے کہ مطعم اور اس کے بیٹوں نے آپ کو اپنے حلقے میں لیا ہوا تھا۔ مطعم کے اس احسان کا رسولِ خدا کے دل پر بہت اثر تھا کہ آپ ﷺ نے اس کے اس برتاؤ کو ہمیشہ یاد رکھا۔ چنانچہ بدر کے دن اسیرانِ بدر کے متعلق ارشاد فرمایا ”اگر آج مطعم بن عدی زندہ ہوتا اور پھر مجھ سے ان بندوں کے بارے میں کلام کرتا تو میں اس کی رعایت سے ان سب کو یک لخت چھوڑ دیتا“۔[38]

---

37 صحیح البخاری، باب الذکر الملائکہ

38 فتح الباری جلد ۶، ص ۲۲۵

سرورِ عالم ﷺ اور قربِ خداوندی (معراج النبی ﷺ)

ان صفحات میں ذکر ہے سرورِ عالم ﷺ کے اس مقام و مرتبہ کا جو معراج کی رات آپ کو نصیب ہوا۔ قربِ خداوندی کا یہ وہ مقام ہے جو سوائے آپ کے کسی اور کے حصے میں نہ آیا۔ خداوندِ عزوجل نے اس واقعہ عظیم کا ذکر قرآن مجید میں فرمایا:

سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِیْ بٰرَکْنَا حَوْلَہٗ لِنُرِیَہٗ مِنْ اٰیٰتِنَا ؕ اِنَّہٗ ھُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ۝[39]

پاک ہے وہ ذات جو اپنے بندے کو رات کے وقت مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک لے گیا۔ جس کے گرد ہم نے برکتیں دی ہیں تاکہ ہم اس کو اپنے چند عجائبات اور نشانیاں دکھلائیں۔ بے شک اللہ ہے سننے والا اور دیکھنے والا۔

ہجرت مدینہ سے قبل سرورِ عالم ﷺ اُم ہانی کے گھر میں آرام فرما رہے تھے کہ جبریلِ امین حاضرِ خدمت ہوئے، آپ کو جگایا گیا اور زمزم کے پاس لے جا کر سینۂ اطہر کو چاک کر کے علم و حکمت سے لبریز کیا گیا۔ سواری کے لیے براق حاضر کیا گیا۔ سرورِ عالم ﷺ براق پر سوار ہو کر مکہ سے بیت المقدس کی جانب روانہ ہوئے، راستے میں آپ نے بے شمار عجائب و غرائب دیکھے۔ اسی سفر میں آپ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اپنی قبر میں نماز پڑھتے دیکھا۔ ایک جماعت کو اس حالت میں دیکھا کہ ان کے ناخن تانبے کے تھے اور وہ اپنے ناخنوں سے اپنے چہروں کو چھیل رہے تھے۔ آپ ﷺ کے استفسار پر جبریل امین نے عرض کیا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو آدمیوں کا گوشت کھاتے ہیں یعنی ان کی غیبت کرتے ہیں اور ان کی آبرو پر حرف گیری کرتے ہیں۔ اسی طرح کی اور بہت سی جماعتیں آپ کو دکھائی

---

39 بنی اسرائیل: ۱

گئیں، ایک قوم کو دیکھا کہ ان کی زبانیں لوہے کی قینچیوں سے کاٹی جارہی ہیں۔ کٹنے کے بعد پھر لمبی ہو جاتی ہیں اور پھر کاٹی جاتی ہیں اور یہ عمل مسلسل جاری ہے۔ جبریل امین نے بتایا کہ یہ آپ کی امت کے وہ خطیب اور واعظ ہیں جو دوسروں کو نصیحت کرتے ہیں اور خود عمل نہیں کرتے[40]۔

سرور عالم ﷺ نے مکے سے بیت المقدس تک کا سفر جبریل امین کی معیت میں طے کیا۔ بیت المقدس میں جملہ انبیاء آپ کے انتظار میں تھے۔ وہاں پہنچ کر آپ نے امامت فرمائی اور سب انبیاء نے آپ کی اقتدا میں نماز ادا کی۔ اس کے بعد آسمان کی جانب سفر کا آغاز ہوا۔ اس سلسلے میں دو قسم کی روایات ہیں۔ بعض روایات کے اعتبار سے آپ نے بقیہ سفر بھی براق کے ذریعے طے فرمایا اور کچھ روایات میں آتا ہے کہ جنت کی ایک سیڑھی کے ذریعے آپ نے آسمانوں کا سفر فرمایا۔ مختلف آسمانوں پر آپ کی بہت سے انبیاء سے ملاقات ہوئی۔ ان میں حضرت آدم علیہ السلام، حضرت عیسیٰ علیہ السلام، حضرت ادریس علیہ السلام، موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ابراہیم علیہ السلام شامل ہیں۔ سرورِ عالم ﷺ جبریل امین کی معیت میں سفر کی ان تمام منزلوں سے گزرتے ہوئے بالآخر اس مقام پر پہنچے جہاں سے آگے جانے کے لیے حضرت جبریل امین نے بھی اعترافِ عجز کیا جسے جامیؒ نے بہت خوب انداز میں شعری جامہ پہنایا ہے۔

اگر یک سرِ مُوئے برتر پرم
فروغ تجلّی بسوزد پرم

یارسول اللہ ﷺ! اگر یہاں سے آگے جانے کے لیے ذرہ برابر بھی آگے بڑھا تو تجلیاتِ الٰہیہ سے میرے پر جل کر خاکستر ہو جائیں گے۔

---

40 خصائص کبریٰ ج ۱، ص ۲۵۶

الغرض اللہ جل شانہ کے فضلِ خاص سے آپ کو مقامِ قرب سے نواز اگیا اور قرآن اس قرب کی وضاحت ان الفاظ سے فرماتا ہے:

فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى ۚ (النجم)

اور محبوبِ خدا کے درمیان فاصلہ دو کمان یا اس سے بھی کم تھا۔

اور دیدارِ خداوندی کی یہ کیفیت تھی کہ آنحضور ﷺ نے ٹکٹی باندھ کر دیکھا یہاں تک کہ آنکھ جھپکنے بھی نہ پائی۔ اس کے بعد سرورِ عالم ﷺ کے الفاظ میں:

فَاَوْحٰى اللّٰهُ اِلٰى مَاشَآءَ اَنْ يُّوْحٰى[41]

میری طرف اللہ نے وحی بھیجی جو چاہی یعنی مجھ سے بلاواسطہ کلام فرمایا۔

یعنی بلاواسطہ کلام اور قربِ خداوندی کی یہ منزل وہ ہے جس سے صرف خاتم النبیّن، جناب احمد مجتبیٰ ﷺ کو سرفراز فرمایا گیا۔

سرورِ عالم ﷺ پر اور آپ کی امت پر پانچ نمازیں فرض کی گئیں۔ پہلے تو پچاس نمازوں کا حکم ہوا لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام کے کہنے پر حضور نے درخواست کی۔ تدریجاً اس تعداد میں کمی کی گئی اور بالآخر پانچ نمازوں کا حکم ہوا لیکن اللہ نے اپنے فضلِ عظیم سے سرورِ عالم ﷺ کی امت پر یہ احسان فرمایا کہ یہ پانچ نمازیں ادا کریں گے تو انہیں پچاس نمازوں کے ثواب کا مستحق قرار دیا جائے گا۔

قربِ خداوندی کی عظمت سے سرفراز ہونے کے بعد آپ مکہ مکرمہ تشریف لائے اور صبح اللہ تعالیٰ کی بے پایاں نعمت کا اظہار فرمایا تو مکہ والوں نے آپ کا مذاق اڑایا۔ انہوں نے کہا کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک شخص ایک ہی رات میں مکہ سے بیت المقدس پہنچا،

---

41 در منثور جلد ۶، ص ۱۲۳

وہاں سے ساتویں آسمان پر گیا اور یہ سب کچھ کرنے کے بعد واپس آ گیا۔ ایک طرف یہ لوگ تھے جو رسول خدا ﷺ کو جھٹلا رہے تھے اور دوسری طرف آپ کے جاں نثار ابو بکر کا طرز عمل تھا کہ انہوں نے کفار سے برملا کہا کہ اگر جناب محمد رسول اللہ ﷺ یہ فرما رہے ہیں تو حق اور سچ فرما رہے ہیں۔ حق اور سچ کے ساتھ یہی وہ نسبت تھی جس نے ابو بکرؓ کو صدیق اکبر بنا دیا۔ بعض اصحاب علم نے معراج کو بالجسد تسلیم نہیں کیا لیکن مجموعی طور پر امت "معراج روح بالجسد" پر یقین رکھتی ہے اور یہی اہل سنت کا عقیدہ ہے۔ حضرت شاہ عبد الحق محدث دہلوی آیت کریمہ سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِیْ بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ لِنُرِیَهٗ مِنْ اٰیٰتِنَا ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ۝ کے تحت لکھتے ہیں:

> احادیث صحیحہ میں آیا ہے کہ میں خانہ کعبہ کے پاس حجر (حطیم) کے اندر کچھ بیدار، کچھ سو رہا تھا کہ جبریل میرے پاس براق لائے۔ اور بعض روایات میں ہے کہ آپ اس وقت اُم ہانی کے گھر میں تھے۔ اس کی تطبیق علماء نے یوں کی ہے کہ اُم ہانی کا گھر حرم میں واقع تھا اور یہ بھی ہے کہ آنحضرت ﷺ کو روحانی طور پر کئی مرتبہ معراج ہوئی۔ ام ہانی کے گھر سے شاید روحانی معراج ہوئی ہو نہ یہ کہ جس کا ذکر یہاں ہے اور اسی طرح وہ جو بعض اہلِ علم معراج کو خواب بینی کہتے ہیں، غالباً ان کی مراد بھی خواب کی معراج ہوئی نہ یہ کہ جو حالتِ بیداری میں روح اور جسم دونوں کے ساتھ ہوئی اور مسجد اقصیٰ تک ایک رات کے کچھ حصے میں جانا تو اس آیت سے ثابت ہے اور پھر آگے آسمان تک احادیث سے جو بحالت مجموعی حدِ تواتر کو پہنچ گیا ہے

اور اسی پر جمہور اہلِ اسلام کا اتفاق ہے"[42]۔

کچھ حضرات نے جو یہ کہا کہ یہ معراج بحالت خواب ہوئی تو اس اعتراض میں کوئی جان نہیں، اس لیے کہ اگر رسول اللہ ﷺ کا دعویٰ صرف اس قدر ہوتا تو مشرکین مکہ کو کوئی اعتراض نہ ہوتا، اس لیے کہ خواب میں تو کوئی بھی شخص مشرق و مغرب کی سیر کر سکتا ہے۔ رہی یہ بات کہ ایک بندے کے لیے یہ کیسے ممکن ہو گیا تو اس سارے عمل کو خداوند بزرگ و برتر نے اپنی ذات سے منسوب کر کے تمام شکوک و شبہات کو رفع فرما دیا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی قدرت سے کوئی چیز باہر نہیں، وہ ہر شئے پر قادر ہے ۔الغرض اللہ جل شانہ، پر ایمان لانے کے بعد اگر کوئی شخص یہ سوچتا اور سمجھتا ہے کہ یہ کیسے اور کس طرح ہوا تو یہ ایمان میں عدم پختگی کی دلیل ہے۔ جب نص سے صراحۃً ثابت ہے کہ اللہ نے جناب رسول اللہ ﷺ کو اس عظمت سے نوازا تو اس کے بعد شک کا بھی گزرنا ایمانی خرابی کا باعث ہو گا۔

علامہ ابن کثیرؒ اس کے متعلق اپنی رائے کا اظہار ان الفاظ میں فرماتے ہیں:

> مسلمان اجتماعی طور پر اس کے قائل ہیں، ہاں بے شک زندیق اور ملحد لوگ اس کے منکر ہیں، وہ خدا کے نور کو اپنے منہ کی پھونکوں سے بجھانا چاہتے ہیں لیکن وہ پوری روشنی کے ساتھ چمکتا ہوا ہی رہے گا، گو کافروں کو برا لگے۔"[43]

معراج النبی ﷺ نے عالم بشریت پر یہ ثابت کر دیا کہ انسان اشرف المخلوقات ہے، وہ اس مقام پر پہنچا ہے جہاں کسی مخلوق کا گزر نہیں ہو سکتا۔ وہ ہمت مردانہ سے کام لے

---

42 تفسیر حقانی (اردو) شاہ عبد الحق محدث دہلوی ج۵، ص۴۵

43 تفسیر ابن کثیر اردو پارہ ۱۵، ص۵

کر ستاروں پر کمندیں ڈال سکتا ہے۔ آج جب مغرب والے چاند اور دیگر سیاروں پر پہنچنے کی باتیں کرتے ہیں تو حیرانگی اور تعجب کی بات نہیں، اس لیے کہ ہمارے آقا جناب رسالت مآب ﷺ اس دور میں جب سائنس کا نام ونشان بھی نہیں تھا، اپنے اللہ کے فضل سے اس مقام پر پہنچے جہاں کا ادراک بھی نہیں کیا جاسکتا۔ معراج النبی ﷺ اس حقیقت کی جانب واضح اشارہ ہے۔

سبق ملا ہے یہ معراج مصطفیؐ سے مجھے
عالم بشریت کی زد میں ہے گردوں
(اقبالؒ)

یثرب میں دعوتِ اسلام

قریش کے ظلم وستم اور طرح طرح کی رکاوٹوں کے باوجود آنحضرت ﷺ اپنے تبلیغی مشن میں سرگرم عمل تھے۔ آپ ﷺ ہر اجتماع سے فائدہ اٹھاتے تھے۔ میلوں میں تشریف لے جاکر دعوتِ حق کا فریضہ سرانجام دیتے تھے، بالخصوص حج کے موقع پر آپ باہر سے آئے ہوئے وفود کے پاس جاتے اور انہیں دعوتِ توحید دیتے۔ حج کے موقع پر دورانِ تبلیغ آپ مدینہ سے آئے ہوئے اوس وخزرج کے لوگوں کے پاس پہنچے۔ یہ لوگ بھی اگرچہ بُت پرست تھے لیکن یہود کی ہمسائیگی کی وجہ سے وہ مذہبی کتابوں سے واقفیت رکھتے تھے اور یہود سے اکثر سنتے رہتے تھے کہ نبی آخر الزمان ﷺ عنقریب تشریف لانے والے ہیں۔ چنانچہ اس پہلی ملاقات میں درج ذیل چھ آدمی حقانیت اسلام پر ایمان لے آئے۔

۱: اسعد بن زرارہؓ

۲: عوف بن الحارثؓ

۳: رافع بن مالک بن عجلانؓ

۴: قطبہ بن عامرؓ

۵: عقبہ بن عامرؓ

۶: جابر بن عبداللہ بن رباب یا عبادہ بن صامتؓ

یہ لوگ دولت ایمان سے مالا مال ہو کر واپس گھروں کو لوٹ گئے۔ یثرب پہنچ کر ہر جگہ ان کی گفتگو کا موضوع آنحضرت ﷺ کی ذاتِ ستودہ صفات تھی۔ اب مدینہ کے ہر گھر میں آپ کا ذکر ہوتا تھا۔ دوسرے سال بارہ آدمی شرفِ باریابی کے لیے تشریف لائے۔ ان میں سے پانچ تو گزشتہ سال مشرف باسلام ہو چکے تھے، سات نئے تھے۔ بارگاہِ رسالت مآب ﷺ میں حاضر ہو کر یہ حضرات بھی نورِ ایمان سے لبریز ہو گئے۔ آنحضرت ﷺ نے عبداللہ بن اُم مکتومؓ اور مصعب بن عمیرؓ کو ان کے ساتھ تبلیغ کے لیے بھیجا۔ خداوند بزرگ و برتر ان اصحاب رسول ﷺ پر کروڑوں رحمتیں اور برکتیں نازل فرمائے، ان کی تبلیغی حکمت عملی نے مدینہ کی کایا پلٹ دی، ان کی شیریں کلامی نے مدینہ والوں کے دل کی دنیا میں ایک انقلاب برپا کر دیا۔ بعض دشمنانِ اسلام یہ لکھتے ہیں کہ اسلام بزورِ شمشیر پھیلا، اسے تاریخِ اسلام سے ناواقفیت کے علاوہ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ورنہ تاریخِ اسلام کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ عبداللہ ابن مکتومؓ اور مصعب بن عمرؓ کے ساتھ کوئی فوج نہیں تھی، البتہ ان کے پاس حقانیتِ اسلام کے روشن دلائل تھے اور انہوں نے دعوت اسلام دیتے وقت مخاطبین سے ہمیشہ یہی کہا کہ اگر ہماری بات دل کو لگے تو قبول کرنا اور اگر تمہارا دل قبول کرنے کے لیے آمادہ نہ ہو تو تم پر کوئی جبر نہیں۔ اللہ کے رسول اور ان کے اصحاب نے ہمیشہ گمراہی اور ہدایت کے راستوں کی نشاندہی فرمائی اور مخالفین کو رَدّ و قبول کے اختیار کے ساتھ چھوڑ دیا۔ ایک دن یثرب میں مصعب بن عمیر تبلیغِ اسلام کا فریضہ سر انجام دے رہے تھے تو اسید بن حضیر انتہائی غصے کے عالم میں ہاتھ میں ننگی تلوار لیے آپہنچے، مصعب نے کہا کہ چند

لمحوں کے لیے بیٹھ جاؤ، میری بات سنو، اگر پسند آئے تو قبول کرلو اور ناپسند ہو تو کنارہ کشی کرلو۔ اسید بن حضیر بیٹھ گئے۔ اب درس گاہِ مصطفوی کے فارغ التحصیل مصعبؓ نے محاسن اسلام پر لیکچر دینا شروع کیا اور قرآن مجید فرقان حمید کی تلاوت کی۔ اس خدائی کلام کو سنتے ہی اسید کے دل و دماغ میں ہلچل مچ گئی۔ پوچھنے لگے کہ اس دین میں داخل ہونے کا طریقہ کیا ہے۔ حضرت مصعب بن عمیرؓ نے فرمایا جسم اور کپڑوں کو صاف کرو، توحید ورسالت کا اقرار کرو اور نماز ادا کرو، فوراً اٹھے، پاک وصاف ہو کر کلمہ شہادت پڑھا اور حلقۂ اسلام میں داخل ہو گئے۔ اسی طرح سعد بن معاذؓ بھی مصعب بن عمیر کی تبلیغی حکمت عملی سے مسلمان ہو گئے اور پھر ان کی ترغیب سے شام سے پہلے پہلے قبیلہ بنی عبد الاشہل کا ہر فرد اسلام کے حلقے میں داخل ہو گیا۔ اس سے اگلے سال حج کے موقع پر مصعب بن عمیرؓ کی قیادت میں مسلمانوں کی ایک جماعت مکہ حاضر ہوئی۔ ان میں تقریباً تہتر مرد اور دو عورتیں شامل تھیں۔ ان حضرات نے خفیہ طور پر سرورِ عالم ﷺ کی خدمت میں حاضری دی۔ حضرت عباس حضور ﷺ کے ساتھ تھے، اگرچہ یہ اس وقت تک اسلام نہیں لائے تھے۔ اس موقع پر ان سب حضرات نے حضور کے دستِ شفاعت پر بیعت کی اور ان اصحابِ یثرب نے بارگاہ مصطفیٰ ﷺ میں درخواست پیش کی کہ آپ ﷺ مدینہ تشریف لے آئیں لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ بھی عرض کی کہ کہیں حضور ہم کو چھوڑ نہ دیں۔ اس پر حضور نے ان لوگوں کے حسنِ سلوک اور طلبِ صادق کے جواب میں جو ارشاد فرمایا، اس نے یثرب والوں کی عظمت کو چار چاند لگا دیے اور یثرب کو مدینۃ النبی ﷺ بنانے کے لیے پیش رفت شروع ہو گئی۔ آپ ﷺ نے جواباً ارشاد فرمایا:

> ہر گز نہیں، تمہاری جان میری جان ہے، تم میرے ہو اور میں تمہارا ہوں، جس سے تمہاری جنگ ہے اس سے میری بھی جنگ ہے، جس سے تمہاری صلح ہے اس سے میری بھی صلح ہے، اس پر سب نے

بخوشی ہاتھ بڑھایا اور بیعت کی"۔

یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ خدانخواستہ یثرب والے یہ سب کچھ کسی دنیاوی غرض وغایت سے نہیں کر رہے تھے بلکہ وہ اس حقیقت سے بخوبی آگاہ تھے کہ اس بیعت کے نتیجے میں انہیں جان ومال، اولاد کا نذرانہ پیش کرنا ہوگا۔ ہر مخالفِ اسلام قوت سے ٹکر لینی ہوگی اور یہی وہ حقیقت تھی جس کی طرف عباس بن عبادہ نے بیعت کے وقت اشارہ کیا تھا اور انصار سے مخاطب ہو کر کہا تھا کہ تمہیں معلوم ہے، تم کس چیز پر بیعت کر رہے ہو، تم کو معلوم ہے کہ تم مال وجان پر کھیلنے کا عہد کر رہے ہو، جواب میں سب نے کہا کہ ہاں ہمیں معلوم ہے کہ ہم اسی پر بیعت کر رہے ہیں، ہم جان ومال کی قربانی سے کبھی دریغ نہیں کریں گے۔ مصائب و آلام ہمیں بیعت کو توڑنے پر مجبور نہیں کر سکیں گے۔اس کے بعد ان اصحاب سے ہی حضور نے بارہ نقیب منتخب فرمائے جن کے اسمائے گرامی ذیل میں درج کیے جاتے ہیں:

۱: اسعد بن زرارہؓ

۲: سعد بن عبادہؓ

۳: سعد بن ربیعؓ

۴: رافع بن مالکؓ

۵: ابو جابر عبد اللہ بن عمروؓ

۶: براء بن معرورؓ

۷: ابو ہیثم بن التیہان

۸: منذر بن عمروؓ

---

44 سیرۃ ابن ہشام ج۱، ص ۱۵۵

۹: عبادہ بن صامتؓ

۱۰: اسید بن حضیرؓ

۱۱: سعد بن خیثمہؓ

۱۲: عبد اللہ بن رواحہؓ

اصحابِ رسول ﷺ کی ہجرت یثرب

اہلِ یثرب کے ساتھ اس معاہدہ کے طے ہو جانے کے بعد آنحضرت ﷺ نے ہجرت کے لیے عام اجازت دے دی۔ کفار کے ستم زدہ مسلمانوں نے دین کی خاطر عظیم قربانی کا مظاہرہ کیا۔ اپنے وطن، گھر، مال، اولاد سب کو چھوڑا اور آہستہ آہستہ یثرب کی جانب کوچ کر گئے اور تاریخ عالم میں ایثار و قربانی اور دین سے لازوال محبت کے انمٹ نشانات چھوڑ گئے۔ یثرب کے مسلمانوں نے آنے والے مہاجر بھائیوں کے لیے اپنے گھروں کے دروازے کھول دیے اور اسلامی اخوت کا وہ تابناک مظاہرہ کیا جو بے مثل و مثال ہے۔ مہاجرینِ مکہ کو گھر کا سا سکون و اطمینان نصیب ہوا۔ وہ امن و چین کی زندگی بسر کرنے لگے۔ اس اجازت عامہ کے بعد تقریباً تمام اصحاب رسول ﷺ یثرب پہنچے، صرف حضرت صدیق اکبر، علی المرتضیٰ اور چند مفلس و نادار صحابہ رہ گئے۔

یثرب کو مدینۃ النبی بننے کا شرف

سرورِ عالم ﷺ کے جان نثار صحابہ کرام کی جماعت مکہ کو الوداع کہہ چکی تھی۔ البتہ صدیق اکبر اور علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہما ابھی مکہ میں ہی تھے۔ آنحضرت اِذنِ الٰہی کے منتظر تھے۔ ادھر قریش بھی باہم مشورہ کر رہے تھے۔

مسلمانوں کو یثرب میں امن و سکون انہیں بہت گراں گزرتا تھا اور ان کی چھٹی حس انہیں آنے والے خطرات کی طرف اشارے کر رہی تھی۔ وہ یہ جان رہے تھے کہ اگر

محمد ﷺ اور ان کے اصحاب مدینہ میں جم گئے تو وہ ان پر کئے گئے مظالم کا انتقام ضرور لیں گے، انہیں کیا معلوم تھا کہ وہ جس ہستی کے درپے آزار ہیں وہ ظلم وزیادتی سے مبرا ہے اور رحمتِ الٰہی کی عظیم مظہر ہے۔ الغرض اسلام کے ازلی دشمن کی زیرِ صدارت دارالندوۃ میں دشمنانِ اسلام کی ایک مجلس منعقد ہوئی۔ اسلام اور داعیٔ اسلام سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے مختلف تجاویز زیرِ بحث آئیں لیکن ابو جہل نے کسی سے بھی اتفاق نہ کیا۔ از خود تجویز پیش کی کہ ہر قبیلہ کے ایک معزز تنومند نوجوان کا انتخاب کیا جائے۔ سب کو تلواروں سے مسلح کیا جائے۔ یہ سب محمد (ﷺ) کے گھر کے باہر کھڑے ہو جائیں اور جب آپ باہر نکلیں تو سب بیک وقت آپ پر حملہ آور ہوں۔ اس طرح کوئی ایک قبیلہ آپ کے خون کا مجرم قرار نہ پائے گا اور بنو عبد مناف میں اتنی ہمت نہیں کہ وہ اتنے قبائل سے بدلہ لے سکیں۔ اس تجویز پر تمام دشمنانِ اسلام نے اتفاق کیا اور مجلس برخاست ہوگئی۔ خداوند عزوجل قرآن مجید میں کفار کی اس میٹنگ کے متعلق سورۃ الانفال میں اشارہ فرماتے ہیں:

> وَاِذْ یَمْکُرُ بِکَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لِیُثْبِتُوْکَ اَوْ یَقْتُلُوْکَ اَوْ یُخْرِجُوْکَ ؕ وَیَمْکُرُوْنَ وَیَمْکُرُ اللّٰهُ ؕ وَاللّٰهُ خَیْرُ الْمٰکِرِیْنَ۝[45]
>
> اور یاد کرو اس گھڑی کو جبکہ کفار تدبیریں کر رہے تھے کہ آپ کو قید میں ڈال دیں یا قتل کر دیں یا باہر نکال دیں۔ وہ اپنی سی تدبیر اڑاتے ہیں اور اللہ جواباً دوسری تدبیر کرتا ہے اور اللہ تدبیر کرنے میں سب سے بڑھ کر ہے۔

آنحضرت ﷺ کو اذنِ الٰہی حاصل ہو چکا تھا۔ چنانچہ ہجرت سے دو تین دن پیشتر آپ ابو بکرؓ کے گھر تشریف لے گئے اور یہ اطلاع دی اور ساتھ ہی حضرت ابو بکر کے

---

45 انفال: ۳۰

استفسار پر یہ خوشخبری سنائی کہ انہیں آپ کے رفیقِ ہجرت ہونے کا شرف واعزاز حاصل ہو گا۔ چنانچہ ہجرت کی رات آپ نے حضرت علی المرتضیٰ کو حکم دیا کہ آج رات وہ آپ کے بستر پر آرام فرمائیں اور کل صبح اہل مکہ کی امانتیں انہیں ادکرنے کے بعد چلے آئیں۔ سرور عالم ﷺ کے پاکیزگی کردار کی یہ عجیب وغریب مثال بھی دیکھیے کہ جان کے دشمن بھی اپنی امانتوں کا امین آپ کو منتخب کرتے ہیں اور آپ کا طرزِ عمل ملاحظہ کیجیے کہ انہی کے ستانے سے مکہ سے رخصت ہو رہے ہیں لیکن امانتوں کی واپسی کے لیے معقول انتظام فرمارہے ہیں۔ اس موقع پر جناب علی المرتضیٰ کی جان نثاری کا ذکر بھی ضروری ہے۔ انہیں خوب معلوم تھا کہ آج کی رات بسترِ رسول ﷺ پر آرام کرنا موت کو دعوت دینا ہے لیکن آقا کے حکم کے بعد انہیں کسی اور چیز کی پرواہ نہ تھی۔ علاوہ ازیں حضور ﷺ نے انہیں فرمادیا تھا کہ آرام سے سوجاؤ تمہیں کوئی گزند نہ پہنچا سکے گا۔ اس لیے انہیں یقین کامل تھا کہ اب کوئی دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت بھی انہیں تکلیف پہنچانے پر قادر نہ ہو گی۔

حسبِ پروگرام کفار نے رات کو آنحضرت ﷺ کے آستانہ مبارک کو گھیرے میں لے لیا لیکن رات کے درمیانی حصہ میں آپ ﷺ انہیں سوتا چھوڑ کر حضرت ابو بکرؓ کو ساتھ میں لیے غار میں پہنچے۔ حضرت ابو بکرؓ نے پہلے ہی سے اس سفر کے لیے دو اونٹنیاں پال رکھی تھیں جن میں سے ایک حضور ﷺ نے خرید لی اور وہ اس سفر میں آپ کے کام آئی۔ ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ آپ ﷺ نے ایک مشتِ خاک پر سورۂ یٰس پڑھ کر ان کفار کی طرف پھینکی جس کے نتیجے میں آپ ان کے درمیان سے نکل گئے اور ان کو کچھ سجھائی نہ دیا[46]۔

رات بھر پہرہ دینے کے بعد علی الصبح جب کفار نے حضرت علیؓ کو آپ ﷺ کے

---

46 عیون الاثر ج۱، ص ۱۷۹

بستر پر آرام کرتا پایا تو حیرانگی کے ساتھ ساتھ ان کے غصے کی کوئی حد نہ رہی۔ بہت پریشان ہوئے کہ ان کی ساری تدبیر خاک میں مل گئی۔ یہاں پر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اس محبت کا ذکر کرنا بے محل نہ ہو گا جو انہیں اپنے آبائی وطن مکہ مکرمہ سے تھی اور کیوں نہ ہو اسی شہر میں آپ کی ولادت و باسعادت ہوئی، اسی شہر کی گلیوں میں چل پھر کر آپ جوان ہوئے، اسی شہر میں آپ پر وحیِ الٰہی کا آغاز ہوا اور ہاں، یہ وہی شہر ہے جہاں حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اللہ کے گھر کی بناء رکھی۔ آج ملت ابراہیمی کے عظیم قائد محسنِ انسانیت جب اس شہر کو الوداع کہہ رہے ہیں تو ان پر عجیب کیفیت طاری ہے اور وہ اس شہر سے اپنے لگاؤ کا اظہار ان الفاظ میں فرماتے ہیں:

> خدا کی قسم! تو اللہ کی بہترین زمین ہے اور سب سے زیادہ اللہ کے نزدیک محبوب ہے، اگر میں نکالا نہ جاتا تو نہ نکلتا[47]۔

تاریخ کے اس اہم ترین واقعے کی تفصیلات انسان کو غور و فکر کی دعوت دیتی ہیں۔ محسنِ اعظم آج بغیر کوئی قصور کئے صرف اور صرف اسلام کی خاطر، دین کی ترویج و اشاعت کے لیے شہر مکہ کو الوداع کہہ رہے ہیں۔

سرورِ عالم ﷺ اپنے عزیز ترین رفیق حضرت صدیق اکبرؓ کی معیت میں غارِ ثور پر پہنچے۔ جاں نثارِ مصطفیٰ ﷺ جناب صدیق اکبر پہلے غار میں داخل ہوئے تاکہ تسلی کر لیں، کوئی موذی چیز اندر نہ ہو، غار کو صاف کیا، غار میں کچھ سوراخ تھے، انہیں اپنا لباس پھاڑ کر بند کیا مگر دو سوراخ باقی رہ گئے۔ آپ نے ان کو اپنے پاؤں کے انگوٹھوں سے بند کر دیا۔ آپ ﷺ اندر تشریف لائے اور اپنے یارِ غار کے زانو پر سر رکھ کر آرام فرمانے لگے۔ آج صدیق اکبرؓ کی خوشی کی انتہا نہ رہی ہو گی۔ محبوب کائنات کا سر ان کی گود میں ہے۔ آج انہیں

---

47 ترمذی شریف

وہ مقام و مرتبہ نصیب ہو رہا ہے جس پر صحابہ کرام ہمیشہ رشک کرتے رہے۔ اس غار کی رفاقت سے متعلق حضرت عمرؓ فرماتے تھے کہ کاش ابو بکر میری ساری نیکیاں لے لے اور رفاقتِ غار کی نیکی مجھے مل جائے۔ القصہ سرورِ عالم ﷺ آرام فرما رہے ہیں اور ادھر صدیق اکبرؓ کے پاؤں کو کسی زہریلی چیز نے ڈس لیا لیکن یارِ غار کے پاؤں میں جنبش نہ ہونے پائی، مبادا میرے آقا کی نیند میں خلل واقع ہو جائے لیکن درد کی شدت سے آنکھوں سے آنسو ٹپکا اور چہرۂ مصطفیٰ ﷺ پر گرا۔ آپ نے پوچھا ابو بکر تجھے کیا ہوا۔ عرض کی میرے ماں باپ آپ پر فدا، مجھے کسی چیز نے کاٹ کھایا، آپ نے زخم پر لعاب دہن لگایا، فوراً درد جاتا رہا۔[48]

اس غار میں آپ نے تین دن تک قیام فرمایا: حضرت ابو بکرؓ کے بیٹے عبداللہ جو نوجوان تھے۔ رات کو غار میں سوتے تھے، صبح صبح چلے جاتے اور قریش کے منصوبوں سے باخبر واپس تشریف لاتے اور آپ کو اطلاع دیتے۔ صدیق اکبر کا غلام عامر بن فہیرہ دن کو بکریاں چراتا اور رات کو دو بکریاں غار کے دھانے پر لے جاتا۔ ان کا دودھ آپ ﷺ اور جناب صدیق اکبر کی خوراک تھا۔ غار کی حفاظت کے لیے اس پر خدائی پہرہ بٹھا دیا گیا۔ دہانے پر مکڑی نے جالا تنا ہوا تھا[49] اور کنارے پر کبوتری نے انڈے دے رکھے تھے۔ کفار سرورِ عالم ﷺ کی تلاش میں جب غار کے کنارے پہنچے تو غار کی اس حالت کو دیکھ کر انہیں شک بھی نہیں گزرا کہ اس میں کوئی چھپا ہوا ہو گا۔ ایک مرتبہ کفارِ مکہ تلاش میں غار کے اس قدر قریب پہنچ گئے کہ ان کے قدموں کی آہٹ سنائی دینے لگی تو ابو بکرؓ نے عرض کیا کہ اگر کسی نے اپنے قدموں کی طرف نظر دوڑائی تو یقیناً ہم کو دیکھ لے گا۔ حضرت صدیق اکبرؓ کو تسلی و تشفی کے لیے جو جواب آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا، اسے قرآن مجید نے ان

---

48 مشکوۃ شریف باب مناقب ابی بکرؓ

49 مشکوۃ شریف باب فی المعجزات

الفاظ میں نقل کیا:

لَا تَحۡزَنۡ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا ۚ [50]

تو بالکل غم نہ کر یقیناً اللہ ہمارے ساتھ ہے۔

مولانا ادریس کاندھلویؒ اس آیت کریمہ کے ضمن میں لکھتے ہیں:

حضرت ابو بکرؓ کا رنجیدہ اور غمگین ہونا اور دشمنوں کو دیکھ کر رونا یہ سب آنحضرت ﷺ کے عشق اور محبت میں تھا۔ اگر حضرت ابو بکرؓ کو اپنی جان کا ڈر ہوتا تو بجائے حزن کے خوف کا لفظ مستعمل ہوتا اس لیے کہ عربی زبان میں حزن کا لفظ رنج و غم کی جگہ یا محبوب کے فراق یا تمنا کے فوت ہو جانے کے محل میں استعمال کرتے ہیں۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام جب کوہِ طور پر گئے اور پیغمبری ملی تو خداوند تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کو حکم دیا کہ اپنے عصا کو زمین پر ڈالو، ڈالا تو اژدھا بن گیا۔ موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام اس سے ڈر کر ایسے بھاگے کہ پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا۔ اس وقت خداوند کریم نے یہ فرمایا۔

یٰمُوۡسٰی لَا تَخَفۡ ۟ اِنِّیۡ لَا یَخَافُ لَدَیَّ الۡمُرۡسَلُوۡنَ ۝

اے موسیٰ مت ڈر میرے پاس رسول ڈرا نہیں کرتے۔

اس جگہ موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اپنی جان کا ڈر ہوا اس لیے اللہ جل شانہٗ نے ان کی تسلی کے لیے فرمایا: لَا تَخَفۡ (ڈرو مت) اور یوں نہیں فرمایا: لَا تَحۡزَنۡ

---

50 توبہ: ۴۰

غمگین نہ ہو

خوف اپنی جان کا ہوتا ہے اور غم کسی کے بچھڑ جانے کا۔ جناب صدیق اکبرؓ کو اپنی پریشانی نہیں تھی۔ پریشانی صرف حضور ﷺ کی تھی کہ مبادا کوئی دشمن حضور کو دیکھ لے[51]۔

تین دن کے بعد آپ کی روانگی بجانب یثرب ہوئی۔ عبد اللہ بن اریقط کو راستے کی رہنمائی کے لیے ساتھ رکھا گیا اور صدیق اکبرؓ نے اپنے غلام عامر بن فہیرہ کو بھی اپنے ساتھ لے لیا۔ راستے میں اُم معبد نامی نیک نفس خاتون کا گھر تھا۔ یہ خاتون اعلیٰ درجہ کی مہمان نواز تھیں۔ قافلہ نبوی ﷺ اُم معبد کے گھر کے پاس رکا اور کوئی خورد و نوش کا سامان خریدنے کی خواہش ظاہر کی مگر کچھ نہ ملا۔ ام معبد کے گھر کے ایک کونے میں ایک انتہائی کمزور بکری کھڑی تھی۔ آپ نے پوچھا یہ کس کی بکری ہے۔ اُم معبد نے جواب دیا یہ بہت کمزور ہے۔ اس لیے دوسری بکریوں کے ساتھ جنگل نہیں گئی۔ آپ نے فرمایا اگر مجھے اجازت ہو تو میں اس کا دودھ دوھ لوں۔ اُم معبد نے عرض کیا اگر اس میں دودھ ہو تو ضرور دوھ لیں۔ آپ ﷺ نے ایک بڑا برتن دودھ کا بھر کر اُم معبد کو پیش کیا۔ انہوں نے پیا۔ پھر آپؐ کے ہمسفروں نے پیا اور آپ نے پھر اسی لاغر بکری کے دودھ سے وہ برتن بھر دیا۔ شام کے وقت اُم معبد کا خاوند گھر لوٹا۔ برتن میں دودھ دیکھ کر اس نے اپنی بیوی سے پوچھا، یہ کیا ماجرا ہے۔ اُم معبد نے کہا کہ ایک بابرکت شخص یہاں سے گزرا، یہ سب اسی کا فیضان ہے۔ اس نے گزرنے والے شخص کا حلیہ پوچھا تو اُم معبد نے جواب دیا۔

میں نے ایک ایسے شخص کو دیکھا جن کی صفائی و پاکیزگی بہت کھلی ہوئی ہے، چہرہ روشن و نورانی ہے، اخلاق نہایت اچھے ہیں، ان میں پیٹ بڑا

---

[51] معارف القرآن: جلد پنجم، تلخیص ص۳۳۹تا۳۴۰

ہونے کا عیب نہیں ہے۔ نہ ان میں کوتاہ گردن اور چھوٹا سر ہونے کی خرابی ہے، وہ حسین و جمیل ہیں۔ آنکھوں میں کافی سیاہی ہے، پلک کے بال خوب گھنے ہیں، آواز میں بلندی ہے، آنکھ میں سیاہی کی جگہ سیاہی خوب تیز ہے اور سفیدی کی جگہ سفیدی خوب تیز ہے، ابروئیں باریک ہیں اور آپس میں ملی ہوئی ہیں، بالوں کی سیاہی بھی خوب تیز ہے، گردن میں بلندی اور ڈاڑھی میں گھنا پن ہے، جب خاموش ہوتے ہیں تو ان پر وقار چھا جاتا ہے اور جب بولتے ہیں تو حسن کا غلبہ ہوتا ہے۔ گفتگو ایسی نگینوں کی لڑی ہوتی ہے جو گر رہے ہوں، وہ شیریں گفتار ہیں، قول فیصل کہنے والے ہیں، ایسے کم گو نہیں جس سے مقصد ادا نہ ہو، نہ فضول گو ہیں، دُور سے دیکھو تو سب سے زیادہ بارعب اور حسین ہیں۔ قریب سے سب سے زیادہ شیریں گفتار و جمیل ہیں، ایسے متوسط اندام ہیں کہ تم درازئ قد کا ان کو عیب نہ لگاؤ گے اور نہ کوئی آنکھ کوتاہ قد ہونے کی وجہ سے انہیں حقیر جانے گی۔ وہ دو شاخوں کے درمیان ایک شاخ تھے (یعنی دو رفیق ان کے ساتھ اور بھی تھے) دیکھنے میں وہ تینوں میں سب سے زیادہ حسین تھے۔ ان کے رفقاء انہیں گھیرے رہتے تھے، اور جب وہ کچھ فرماتے تھے تو لوگ اچھی طرح آپ کا کلام سنتے تھے، اگر کوئی حکم دیتے تھے تو سب تعمیلِ حکم کے لیے دوڑ پڑتے تھے۔ وہ مخدوم تھے اور ایسے کہ جن کی خدمت کے لیے لوگ دوڑتے آتے تھے، نہ وہ ترش رو تھے نہ زیادہ گو تھے[52]۔

---

52 طبقات الکبریٰ لابن السعد (اردو ترجمہ) ج ۱، ص ۲۴۳

ابو معبد نے یہ اوصاف حمیدہ سنتے ہی اپنی زوجہ سے کہا:

اے ام معبد یہ تو وہی شخصیت تھی جس کا ہم سے ذکر کیا گیا یعنی محمد رسول اللہ ﷺ۔

سرور عالم ﷺ کا سفر جاری تھا اور اللہ کے فضل سے آپ بعافیت اپنی منزل کی جانب گامزن تھے۔ لیکن قریش کو حضور ﷺ کا یوں صحیح وسلامت مکہ سے نکل جانا بہت پریشان کر رہا تھا۔ چنانچہ انہوں نے ایک اشتہار دیا جس میں یہ اعلان کیا گیا کہ جو شخص محمد (ﷺ) اور ابو بکر (رضی اللہ عنہ) کو گرفتار کر کے لائے گا، اسے ہر ایک کے معاوضے میں سو اونٹ انعام دیے جائیں گے۔ سراقہ بن جعشم روایت کرتے ہیں کہ مجھے ایک شخص نے خبر دی کہ میں نے چند اشخاص کو ساحلی راستے جاتے ہوئے دیکھا ہے تو مجھے یقین ہو گیا کہ وہ آپ اور آپ کے رفقا ہیں۔ انعام کے لالچ میں سراقہ بن جعشم اپنے گھوڑے پر سوار سرور عالم ﷺ کے تعاقب میں نکلا اور آپ کے قریب جا پہنچا۔ صدیق اکبر نے پلٹ کر دیکھا تو گھبرا کر فرمایا کہ یارسول اللہ ﷺ ہم گرفتار کر لیے جائیں گے۔ یہ شخص ہماری تلاش میں ہی چلا آرہا ہے لیکن آنحضرت ﷺ نے فرمایا آنے دو، اسی اثنا میں سراقہ کے گھوڑے کے پاؤں زمین میں دھنس گئے، گھوڑے کو باہر نکال کر سراقہ نے فال نکالی جو اس کے حق میں نہ نکلی لیکن لالچ بری بلا ہے، اس نے پھر ایک بار کوشش کی، اب کی بار اس کا گھوڑا گھٹنوں تک دھنس گیا، اب اسے یقین ہو گیا کہ اس ہستی پر مجھے غلبہ حاصل نہ ہو سکے گا۔ نصرتِ الٰہی اس کے شامل حال ہے، اس نے حضور سے دعا کی درخوست کی۔ آپ نے دعا فرمائی تو اس کے گھوڑے کے پاؤں زمین سے نکلے، سراقہ کی بصیرت نے اسے باخبر کر دیا کہ یہ ہستی بالآخر عرب و عجم کی تاجدار ہو گی۔ یہی وہ خیال تھا جس کی بنا پر اس نے امن اور معافی نامہ کی درخواست کی جسے آپ نے قبول فرمایا اور آپ کے حکم سے عامر بن فہیرہ نے معافی نامہ لکھ کر سراقہ کے حوالے کیا۔ سراقہ وہاں سے واپس چلا آیا اور راستے میں جو آدمی بھی اسے حضور کی تلاش میں ملا اسے یہ یقین دلا کر

کہ اس راستے پر آپ نہیں ہیں، واپس اپنے ساتھ لے آیا۔ راستے میں حضرت زبیر سے بھی آپ کی ملاقات ہوئی۔ حضرت زبیر ایک کاروانِ تجارت کے ساتھ شام کے سفر سے واپس تشریف لا رہے تھے۔ انہوں نے حضور ﷺ اور جناب صدیق اکبرؓ کے لیے سفید لباس پیش کیے۔

آپ کی مکہ سے روانگی کی خبر یثرب پہنچ چکی تھی اور یثرب والے سراپا انتظار تھے، ہر روز شہر سے باہر آکر اپنے آقا جناب محمد ﷺ کا انتظار کرتے، پورا دن یوں گزر جاتا، شام کو مایوس ہو کر اگلے دن کی امید لیے اپنے گھروں کو لوٹ جاتے، کئی روز سے سرورِ عالم ﷺ کے انتظار میں پورا دن گزار دینا ان کا معمول بن چکا تھا، ایک دن جب وہ اپنے گھروں کو لوٹ چکے تھے کہ ایک یہودی نے اپنے مکان کی چھت سے چند سواروں کو آتے دیکھا اور سمجھ گیا کہ ہو نہ ہو یہ وہی ہستی ہے جس کا مسلمان شدت سے انتظار کر رہے ہیں۔ اس نے بلند آواز میں پکار کر کہا کہ اے اہل عرب! جس کا تم انتظار کرتے تھے وہ آ گیا۔ تمام شہر نعرہائے تکبیر سے گونج اٹھا۔ پرستارانِ مصطفیٰ والہانہ انداز میں اپنے گھروں سے نکل پڑے تاکہ محبوبِ کائنات کے استقبال کا شرف حاصل کر سکیں۔ اَلصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلَیْکَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہ کے استقبالیہ نعروں کی گونج میں یثرب کی نواحی بستی قبا میں آپ کا ورود ہوا۔ چند دن میں حضرت علی بھی امانتوں کی ادائیگی کے بعد اسی مقام پر آپ سے آ ملے۔ سرورِ عالم ﷺ کی تشریف آوری سے قبل یہ شہر یثرب کے نام سے مشہور تھا۔ مگر نبی آخر الزمان ﷺ نے قدم رنجہ فرما کر اس شہر کو مدینۃُ النبی (نبی کا شہر) کا شرف بخشا۔ چنانچہ تاریخ نے پھر اس شہر کو ہمیشہ مدینۃُ النبی کے نام سے یاد کیا۔ یہ بھی عجیب و غریب واقعہ ہے کہ جو قریب تھے وہ دُور ہو گئے اور جو دُور تھے وہ قریب تر آ گئے، نبی کے میزبان اور انصارِ مدینہ کے نام سے مشہور ہو گئے۔ انصار کی یہ عظمت انہی کا حصہ ہے۔ کروڑوں عظمتیں ان کی اس عظمت پر قربان کی جا سکتی ہیں۔

پہلا دینی مرکز: مسجدِ قبا

کسی بھی پیغام اور نصب العین کو پھیلانے کے لیے کسی مرکزی مقام کی انتہائی ضرورت ہوتی اور پھر مسلمانوں کا دین جو اجتماعی دین ہے، اسے ایک مرکز اجتماعیت کی ضرورت تھی، جہاں تمام مسلمان جمع ہو کر اللہ وحدہٗ لاشریک کی عبادت بجالائیں۔ چنانچہ ورُود قبا کے بعد آنحضرت ﷺ نے اولاً تعمیرِ مسجد کی ابتدا فرمائی اور مسلمانوں کی یہ وہ پہلی مسجد ہے جس کا سنگِ بنیاد سرورِ عالم ﷺ نے خود اپنے مبارک ہاتھوں سے رکھا اور حضرت ابو بکرؓ و عمرؓ سمیت تمام موجود صحابہ نے اس مسجد کی تعمیر میں حصہ لیا۔ قرآنِ مجید، فرقانِ حمید اس مسجد کی عظمت اور اس کے تعمیر کنندگان کے اخلاص و للّٰہیت پر ان الفاظ میں مہر تصدیق ثبت کرتا ہے۔

لَمَسْجِدٌ أُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ أَوَّلِ يَوْمٍ أَحَقُّ أَنْ تَقُوْمَ فِيْهِ ۭ فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ أَنْ يَّتَطَهَّرُوْا ۭ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ ۝[53]

البتہ جس مسجد کی بنیاد پہلے دن ہی سے تقویٰ پر رکھی گئی وہ مسجد اس کی پوری مستحق ہے کہ آپ اس میں جا کھڑے ہوں، اس مسجد میں ایسے مرد ہیں جو ظاہری اور باطنی طہارت اور پاکی کو پسند کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ بھی ایسے پاک وصاف رہنے والوں کو پسند کرتے ہیں۔

اس مسجد کی تعمیر میں دیگر صحابہ کے ساتھ مل کر آپ ﷺ نے بنفس نفیس حصہ لیا اور آنے والی مسلمان نسلوں کو یہ سبق دیا کہ اپنے ہاتھوں سے کام کرنا ذلت نہیں عزت ہے۔ سیّد سلیمان ندویؒ وفاء الوفاء کے حوالے سے لکھتے ہیں:

مسجد کی تعمیر میں مزدوروں کے ساتھ آپ خود بھی کام کرتے تھے،

---

53 التوبہ: ۱۰۸

بھاری بھاری پتھروں کے اٹھاتے وقت جسم مبارک خم ہو جاتا تھا،
عقیدت مند آتے اور عرض کرتے، ہمارے ماں باپ آپ پر فدا
ہوں، آپ چھوڑ دیں، ہم اٹھالیں گے، آپ ان کی درخواست قبول
فرماتے ہیں لیکن پھر اسی وزن کا دوسرا پتھر اٹھالیتے ہیں"[54]۔

آج اس چودھویں صدی میں مساوات کے کھوکھلے نعرے بلند کرنے والے اس حقیقی محسن کائنات ﷺ کے اسوۂ حسنہ پر نگاہ ڈالیں جو صرف مساوات پر لیکچر نہیں دیتا تھا، امیر اور غریب میں فرق ختم کرنے کے بلند بانگ دعوے نہیں کرتا تھا بلکہ اپنے عمل سے ثابت کر کے دکھا رہا تھا کہ بحیثیت انسان سب برابر ہیں۔

پہلی نمازِ جمعہ

قبا کی بستی میں چودہ دن کے قیام کے بعد آپ ﷺ شہر جانے کے لیے روانہ ہوئے۔ راستے میں نماز کا وقت آگیا، یہ جمعہ کا دن تھا۔ چنانچہ محلہ بنی سالم میں آپ نے پہلی نمازِ جمعہ ادا فرمائی اور خطبہ ارشاد فرمایا جو سب سے پہلا خطبۂ نمازِ جمعہ تھا۔

شہر میں آمد

نبی آخر الزمان ﷺ کی تشریف آوری کی خبر سنتے ہی مدینہ والوں کے چہرے خوشی سے دمک اٹھے۔ کیف و مستی کے عالم میں ڈوبے ہوئے اپنے گھروں سے باہر نکل آئے۔ جوش و خروش کی یہ کیفیت تھی کہ پردہ نشین خواتین اپنے گھروں کی چھتوں پر نکل آئیں اور استقبالِ رسول کی خوشی کا اظہار ان مشہور اشعار سے کرنے لگیں:

---

[54] سیرت النبی ج ۱، ص ۲۷۶

طَلَعَ الْبَدْرُ عَلَيْنَا

چاند نکل آیا ہے

مِنْ ثَنِيَّاتِ الْوَدَاعْ

کوہ وداع کی گھاٹیوں سے

وَجَبَ الشُّكْرُ عَلَيْنَا

ہم پر خدا کا شکر واجب ہے

مَادَعٰى لِلّٰهِ دَاعْ

جب تک دعا مانگنے والے دعا مانگیں

مدینۃُ النبی کی معصوم بچیاں دف بجا رہی تھیں اور یہ اشعار گا گا کر اپنی عقیدت کا اظہار کر رہی تھیں۔

نَحْنُ جَوَارٍ مِّنْ بَنِي النَّجَار

يَا حَبَّذَا مُحَمَّدٌ مِنْ جَارٍ

ہم خاندان نجار کی لڑکیاں ہیں، محمد ﷺ کیا اچھے ہمسایہ ہیں۔

آپ ﷺ نے ان معصوم بچیوں سے پوچھا کہ کیا تم مجھ کو چاہتی ہو، بولیں ہاں۔ فرمایا میں بھی تم کو چاہتا ہوں۔ کتنی خوش قسمت بچیاں ہیں جنہیں استقبالِ رسول کا شرف حاصل ہو رہا ہے اور کس عظمت کی مالک ہیں کہ رسولِ عربی ﷺ ان سے پیار فرما رہے ہیں۔ یہ اللہ کی وہ خاص عنایت ہے جس کے لیے اہلِ مدینہ کو مختص کیا گیا ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ (اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے اپنے فضل و عنایات کے لیے مختص فرمالیتا ہے)۔

حضرت ابو ایوبؓ، میزبانِ رسول ﷺ

حضرت ابو ایوب انصاریؓ کی قسمت کے کیا کہیے کہ ناقہ رسول نے ان کے مکان کا

انتخاب فرما کر انہیں میزبانیٔ رسول کے شرف سے مشرف فرمادیا۔ حضرت ابو ایوبؓ کا مکان دو منزلہ تھا۔ آنحضرت ﷺ نے ملاقاتیوں کی سہولت کے لیے نچلی منزل پسند فرمائی۔ آپ سات ماہ تک یہیں قیام پذیر رہے۔

ابو ایوبؓ انصاری اور محبتِ رسول ﷺ

ابو ایوب اَنصاریؓ دونوں وقت بار گاہِ رسول ﷺ میں کھانا پیش کرتے اور جو کھانا بچ جاتا اسے خود تناول کرتے۔ محبتِ رسول کا تقاضا دیکھیے کہ جہاں رسول اللہ ﷺ کی انگلیوں کے نشان ہوتے وہیں اپنی انگلیاں رکھتے۔ ایک دن اوپر کی منزل میں پانی کا برتن ٹوٹ گیا ابو ایوب انصاری کو خیال پیدا ہوا کہ پانی نیچے جاکر حضور ﷺ کو تکلیف پہنچائے گا۔ چنانچہ گھر میں موجود ایک ہی لحاف سے پانی کو جذب کر لیا۔

اِسلامی تاریخ کی ابتداء

واقعہ ہجرت کو تاریخ اسلام میں زبردست اہمیت حاصل ہے۔ یہ واقعہ دو ادوار کے درمیان ایک حد فاصل ہے۔ مکی دور اور مدنی دور۔ مصائب و آلام کا دور اور فتح و نصرت کا دور، الغرض واقعۂ ہجرت سے اسلام ایک نئے دور میں داخل ہوتا ہے اور یہیں سے اسلامی اقتدار کی ابتدا ہوتی ہے۔ اسلام چونکہ انفرادی مذہب نہیں بلکہ ایک اجتماعی دین ہے۔ اسلام صرف ایک فرد کو نہیں بلکہ پورے معاشرے کو صالح دیکھنا چاہتا ہے، وہ ایک ایسا مکمل ضابطہ حیات ہے جو زندگی کے ہر شعبے کی اصلاح کے لیے رہنما اصول فراہم کرتا ہے چنانچہ ایسا دین جب تک غالب نہ ہو با اقتدار و با اختیار نہ ہو، وہ اپنے نظام قائم نہیں کر سکتا۔ ظاہر ہے کہ مکہ کی فضا میں یہ عمل ممکن نہیں تھا اور نصرتِ الٰہی سے مدینہ طیبہ کی فضا اس نظام کو جذب کرنے کے لیے پوری طرح آمادہ تھی، اور یہی وہ بنیادی غرض تھی جس کی خاطر سرورِ عالم ﷺ اور آپؐ کے صحابہ کرامؓ نے مدینہ طیبہ کا رخ کیا۔ واقعۂ ہجرت سے تاریخ اسلام کے ایک نئے

دور کا آغاز ہوتا ہے۔ اس لیے واقعۂ ہجرت کو تاریخ اسلامی کا سنگ میل قرار دیا گیا۔ تاریخ اسلامی کے اجراء کے سلسلے میں جب گفت وشنید ہوئی، حضرت فاروق اعظمؓ نے مشاورت کے لیے صحابہ کرام کا اجلاس طلب کیا۔ آپ نے صحابہ سے فرمایا کہ "تاریخ اسلامی کی ابتدا واقعہ ہجرت سے ہونی چاہیے۔ اس لیے کہ ہجرت ہی سے حق اور باطل میں فرق قائم ہوا اور ہجرت ہی سے اسلام کی عزت اور غلبہ کی ابتدا ہوئی"۔[۵۵] چونکہ ہجرت کے سلسلے میں ماہِ محرم میں انصار مدینہ سے گفتگو ہوئی تھی اس لیے محرم ہی کو سال کا اوّل مہینہ قرار دیا گیا۔

تعمیرِ مسجدِ نبویؐ

مدینہ میں قیام کے بعد سب سے پہلے آپؐ نے خانۂ خدا کی تعمیر فرمائی۔ ابو ایوب انصاریؓ کے گھر کے قریب کچھ زمین خالی پڑی تھی۔ معلوم کرنے پر پتہ چلا کہ یہ دو یتیم بھائیوں کی زمین ہے۔ ان سے بات چیت کی گئی تو انہوں نے یہ زمین مفت نذر کرنا چاہی لیکن آپ نے بااصرار قیمت کی ادائیگی فرمائی اور اس جگہ مسجد نبویؐ کی تعمیر ہوئی۔ اس مسجد کی دیواریں کچی تھیں، کھجور کی چھت تھی اور کھجور کے ہی ستون تھے۔ اس مسجد کی تعمیر میں آنحضرت ﷺ سمیت تمام صحابہ کرام شریک تھے۔ اس وقت تک چونکہ مسلمانوں کا قبلہ بیت المقدس تھا۔ اس لیے دیوارِ قبلہ بیت المقدس کی جانب ہی رکھی گئی۔

صُفّہ اور اصحابِ صُفّہ

مدینہ منورہ میں مسجد نبوی کے ساتھ مسجد کے باہر کی طرف جانب شمال ایک چبوترہ تھا۔ اس چبوترے پر مسجد نبوی کی طرح کھجور کی پتیوں سے چھت ڈال دی گی تھی۔ اس کو صفۃ المسجد کہا جاتا تھا جو بعد میں مختصر ہو کر "الصفہ" کہلانے لگا۔ الصفہ کا مادہ لغوی ص۔

---

55 سیرت المصطفیٰ، محمد ادریس کاندھلوی ج۱، ص۳۳۹

ف۔ف ہے۔ کسی بڑی تعمیر کے برابر کوئی چبوترہ بیٹھنے کے لیے بنادیا جائے تو اسے صفۃ البناء یا صفۃ البیت کہتے ہیں۔ مسجد کے ساتھ ایسی نشست بنادی جائے تو اسے صفۃ المسجد کہتے ہیں۔ چنانچہ مسجد نبوی کے ساتھ بھی اسی قسم کی جگہ تھی جہاں پر مختلف اوقات میں بعض صحابہ کرام قیام پذیر رہتے تھے۔ یہ وہ حضرات قدسی صفات تھے جو اپنا اکثر وقت تعلیم کلام الٰہی میں صرف کرتے تھے اور یا پھر سرورِ عالم ﷺ کی صحبت سے فیضیاب ہوتے تھے، ان میں سے اکثر لوگ وہ ہوتے تھے جو عشقِ رسالت مآب ﷺ میں گرفتار ہو کر مدینہ طیبہ آ پہنچے تھے مگر یہاں پر ان کا کوئی گھر یا ٹھکانہ نہیں تھا لیکن یہ لوگ کسی دوسرے پر بوجھ نہیں بنتے تھے۔ ان میں سے بعض دن کو جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر لاتے تھے اور انہیں فروخت کر کے اپنے خورد و نوش کا انتظام کرتے تھے۔ بعض ایسے لوگ ہیں کہ انہوں نے جب اپنا گھر وغیرہ بنالیا تو وہاں منتقل ہو گئے۔

حاکم نے اپنی مستدرک میں حسبِ ذیل اصحاب کے اسمائے گرامی اصحاب صفّہ میں لکھتے ہیں:

۱: حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ

۲: حضرت بلال بن رباحؓ

۳: حضرت عمار بن یاسرؓ

۴: حضرت ابو عبیدہ عامر بن الجراحؓ

۵: حضرت مقداد بن عمروؓ

۶: حضرت خباب بن ارتؓ

۷: حضرت صہیب بن سنانؓ

۸: حضرت زید بن الخطابؓ

۹: حضرت کنانہ بن حصینؓ

۱۰: حضرت ابو کبشہؓ مولی رسول

۱۱: حضرت صفوان بن بیضاءؓ

۱۲: حضرت ابو عبد بن جبرؓ

۱۳: حضرت مسطح بن اثاثہؓ

۱۵: حضرت مسعود بن ربیعؓ

۱۶: حضرت عکاشہ بن محصنؓ

۱۷: حضرت عمیر بن عوفؓ

۱۸: حضرت عویم بن ساعدہؓ

۱۹: حضرت ابولبابہؓ

۲۰: حضرت کعب بن عمیرؓ

۲۱: حضرت خباب بن سیافؓ

۲۲: حضرت عبد اللہ بن انیسؓ

۲۳: حضرت ابوذر جندب غفاریؓ

۲۴: حضرت عتبہ بن مسعود ہذلیؓ

۲۵: حضرت عبد اللہ بن عمرؓ

۲۶: حضرت سلمان الفارسیؓ

۲۷: حضرت حذیفہ بن الیمانؓ

۲۸: حضرت حجاج بن عمر الاسلمیؓ

۲۹: حضرت ابوہریرہؓ

۳۰: حضرت ابوالدرداءؓ

۳۱: حضرت عبد اللہ بن زید جہنیؓ

۳۲: حضرت ثوبانؓ مولی رسولؐ

۳۳: حضرت معاذ بن الحارثؓ

۳۴: حضرت سائب بن الخلادؓ

۳۵: حضرت ثابت بن ودیعہؓ

بھائی چارے کا بے مثال مظاہرہ

یوں تو تمام امتِ مسلمہ اخوت میں منسلک ہے اور اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ کا ارشاد اسی حقیت کا بیان ہے لیکن اس اخوت و یگانگت کا جو عملی مظاہرہ مدینہ طیبہ میں نظر آیا، تاریخ اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر و عاجز ہے۔ مکہ کے مہاجرین عشق رسالت مآب ﷺ اور حفاظت دین کے لیے اپنا گھر بار، مال و متاع سب کچھ چھوڑ کر مدینہ پہنچ گئے۔ ظاہر ہے کہ نئی جگہ انہیں معاشی مسئلہ درپیش تھا اور اس کے ساتھ ساتھ یہاں کے باشندوں سے ان کی کوئی خاص شناسائی نہ تھی، سرورِ عالم ﷺ نے اس گتھی کو ایسی خوبصورت تدبیر کے ساتھ سلجھایا کہ بیگانگی کا کوئی شائبہ بھی باقی نہ رہا اور اس کے ساتھ مہاجرین کی مالی مشکلات بھی حل ہوتی چلی گئیں۔ آپ نے ایک مہاجر اور ایک انصاری کو آپس میں بھائی بھائی بنا دیا۔ سرورِ عالم ﷺ کی زبانِ مبارک نے جن دو صحابیوں کو رشتۂ اخوت میں منسلک کیا، ان کی اخوت و یگانگت سگے بھائیوں کی محبت سے بھی بڑھ گئی۔ انصار نے ایثار و قربانی کا وہ حیرت انگیز نمونہ پیش کیا جسے تاریخ کے صفحات میں ہمیشہ نمایاں حیثیت حاصل رہے گی۔ انہوں نے مہاجرین کو مال و دولت، زمین و جائیداد اور کھیتی باڑی میں برابر کا شریک کر لیا[56]۔ ''انصار کی فراخدلانہ محبت کا اندازہ اس سے کیجیے کہ عبدالرحمٰن بن عوف کی مواخات سعد بن ربیع کے

[56] صحیح بخاری ج۵، ص۸۸

ساتھ ہوئی تھی۔ یہ عبدالرحمٰن کو اپنے گھر لے گئے اور کہا کہ اس تمام مال واسباب میں نصف آپ کا ہے، اسے قبول کیجیے اور سنئے! میری دو بیویاں ہیں، آپ جس کو پسند کریں میں اسے طلاق دے دوں گا، اس سے آپ نکاح کر لیجیے[57]۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ "آپ کے مال وعیال میں اللہ برکت دے، مجھے تو بازار کا راستہ بتا دیجیے"۔ سرورِ عالم ﷺ کی اس پیغمبرانہ حکمتِ عملی سے دو اہم فائدے حاصل ہوئے۔ ایک تو مہاجرین کا معاشی مسئلہ حل ہوا جس کا ذکر اوپر کی سطور میں کیا جا چکا ہے، دوسرا اہم فائدہ یہ ہوا کہ انصار کو مہاجرین کے ساتھ رشتۂ اخوت میں پرو کر انہیں وہ "معلمین اخلاق" فراہم کر دیے گئے جنہیں گزشتہ کئی سالوں سے صحبت رسول کی دولت میسر تھی اور جن کے اخلاق وعادات پر اخلاقِ رسول کی چھاپ لگ چکی تھی۔ الغرض مؤاخات کا یہ مظاہرہ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی عالی ظرفی، ایثار اور محبت و یگانگت کا بے مثل نمونہ ہے۔

اذان کی ابتداء

مدینہ طیبہ میں مسجد نبوی کی تعمیر مکمل ہونے کے بعد نماز کے وقت لوگوں کو جمع کرنے کا مسئلہ زیر بحث آیا۔ تمام صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے بہت سے مشورے دیے۔ کسی نے کہا آگ روشن کی جائے، مسلمان اسے دیکھ کر جمع ہو جایا کریں گے۔ یہ طریقہ مجوسیت سے مشابہت رکھتا تھا، اس لیے آنحضرت ﷺ نے اسے ناپسند فرمایا۔ اسی طرح بعض نے ناقوس تجویز کیا اور بعض نے اس طرح کے اور طریقے پیش کیے۔ شروع میں آنحضرت ﷺ نے حضرت بلال کو حکم دیا کہ "الصلوٰۃ جامعۃ" کی ندا دیا کریں۔ یہ طریقہ

---

57 صحیح بخاری ج۵، ص۸۸

جاری تھا کہ حضرت عبداللہ بن زید انصاریؓ کو خواب میں اذان کا مروجہ طریقہ دکھایا گیا۔ انہوں نے بارگاہ رسالت مآب ﷺ میں اپنا خواب بیان کیا۔ حضور ﷺ نے فرمایا یہ رؤیا حق ہے اور حضرت عبداللہ کو حکم دیا کہ حضرت بلالؓ کو کلماتِ اذان کی تلقین کر دو۔ انہوں نے حضرت بلال کو کلمـاتِ اذان یاد کرا دیے اور اس سے مروجہ اذان کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

دنیا کا سب سے پہلا تحـریری دستور

مدینہ پہنچنے کے بعد آنحضرت ﷺ نے مدینہ میں بسنے والی تین اقوام نصاریٰ یہود اور مسلمانوں کے درمیان ایک معاہدہ قلم بند کرایا جو تاریخ میں "میثاق مدینہ" کے نام سے مشہور ہوا۔ اور یہ وہ پہلا تحریری دستور ہے جو آج تک تاریخ کے صفحـات میں محفوظ ہے۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب لکھتے ہیں "دنیا کا سب سے پہلا تحریری دستور آنحضرت ﷺ نے تحریر کروایا۔ غرض عام قواعد و قوانینِ ملک کم و بیش تحریری صورت میں ہر جگہ ملتے ہیں لیکن دستور مملکت کو عام قوانین سے علیحدہ تحریری صورت میں لانا اس کی نظیر باوجود بڑی تلاش کے مجھے عہدِ نبوی سے پہلے نہیں مل سکی[58]۔

ہجرت کے پہلے ہی سال آنحضرت ﷺ نے یہ نوشتہ مرتب فرمایا۔ اس دستور کی اہمیت کو غیر مسلم مؤرخین نے بھی تسلیم کیا ہے۔ اس دستور کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ شروع دَورِ اسلام میں قرآن کے علاوہ کوئی دوسری چیز لکھنے کی ممانعت تھی لیکن اس دستور کو آنحضرت ﷺ نے خود قـلم بند کروایا۔

---

58 عہد نبوی میں نظام حکمرانی۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ۔ ص ۷۵

دستور کے متن کا ترجمہ[59]

رحم فرمانے والے مہربان خدا کے نام سے

۱: یہ ایک حکم نامہ ہے نبی اور اللہ کے رسول محمد کا قریش اور اہل یثرب میں سے ایمان اور اسلام لانے والوں اور ان لوگوں کے مابین جو ان کے تابع ہوں اور ان کے ساتھ شامل ہو جائیں اور انکے ہمراہ جنگ میں حصہ لیں۔

۲: تمام (دنیا کے) لوگوں کے بالمقابل ان کی ایک علیحدہ سیاسی وحدت (امت) ہو گی۔

۳: قریش سے ہجرت کر کے آنے والے اپنے محلے کے (ذمہ دار) ہوں گے اور اپنے خون بہا مل کر دیا کریں گے اور اپنے ہاں کے قیدی کو خود بخود فدیہ دے کر چھڑائیں گے تاکہ ایمان والوں کا باہمی برتاؤ نیکی اور انصاف کا ہو۔

۴: اور بنی الحارث بن خزرج اپنے محلے کے ذمے دار ہوں گے اور حسب سابق اپنے خون بہا مل کر دیا کریں گے اور ہر گروہ اپنے ہاں کے قیدی کو خود فدیہ دے کر چھڑائے گا تاکہ ایمان والوں کا باہمی برتاؤ نیکی اور انصاف کا ہو۔

۵: اور بنی ساعدہ اپنے محلے کے ذمے دار ہوں گے اور حسب سابق

59 دستور کے متن کا یہ ترجمہ اور ترتیب ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کی کتاب عہد نبوی میں نظام حکمرانی سے لی گئی ہے۔

اپنے خون بہا مل کر دیا کریں گے اور ہر گروہ اپنے ہاں کے قیدی کو خود فدیہ دے کر چھڑائے گا تا کہ ایمان والوں کا باہمی برتاؤ نیکی اور انصاف کا ہو۔

۶: اور بنی جشم اپنے محلے کے ذمے دار ہوں گے اور حسب سابق اپنے خون بہا مل کر دیا کریں گے اور ہر گروہ اپنے ہاں کے قیدی کو خود فدیہ دے کر چھڑائے گا تا کہ ایمان والوں کا باہمی برتاؤ نیکی اور انصاف کا ہو۔

۷: اور بنی النجار اپنے محلے کے ذمے دار ہوں گے اور حسب سابق اپنے خون بہا مل کر دیا کریں گے اور ہر گروہ اپنے ہاں کے قیدی کو خود فدیہ دے کر چھڑائے گا تا کہ ایمان والوں کا باہمی برتاؤ نیکی اور انصاف کا ہو۔

۸: اور بنی عمرو بن عوف اپنے محلے کے ذمے دار ہوں گے اور حسب سابق اپنے خون بہا مل کر دیا کریں گے اور ہر گروہ اپنے ہاں کے قیدی کو خود فدیہ دے کر چھڑائے گا تا کہ ایمان والوں کا باہمی برتاؤ نیکی اور انصاف کا ہو۔

۹: اور بنی العیث اپنے محلے کے ذمے دار ہوں گے اور حسبِ سابق اپنے خون بہا مل کر دیا کریں گے اور ہر گروہ اپنے ہاں کے قیدی کو خود فدیہ دے کر چھڑائے گا تا کہ ایمان والوں کا باہمی برتاؤ نیکی اور انصاف کا ہو۔

۱۰: اور بنی الاوس اپنے محلے کے ذمے دار ہوں گے اور حسبِ سابق اپنے خون بہا مل کر دیا کریں گے اور ہر گروہ اپنے ہاں کے قیدی کو خود

فدیہ دے کر چھڑائے گا تاکہ ایمان والوں کا باہمی برتاؤ نیکی اور انصاف کا ہو۔

۱۱: الف۔ اور ایمان والے کسی قرض کے بوجھ سے دبے ہوئے کو مدد دیے بغیر چھوڑ نہ دیں گے تاکہ ایمان والوں کا باہمی برتاؤ نیکی اور انصاف کا ہو۔

ب۔ اور یہ کہ کوئی مومن دوسرے مومن کے مولیٰ (معاہداتی بھائی) سے خود معاہدہ برادری نہیں کرے گا۔

۱۲: اور متقی ایمان والوں کے ہاتھ ہر اس شخص کے خلاف اٹھیں گے جو ان میں سرکشی کرے یا استحصال بالجبر کرنا چاہے یا گناہ یا تعدی کا ارتکاب کرے یا ایمان والوں میں فساد پھیلانا چاہے اور ان کے ہاتھ سب مل کر ایسے شخص کے خلاف اٹھیں گے خواہ وہ ان میں سے کسی کا بیٹا ہی کیوں نہ ہو۔

۱۳: اور کوئی ایمان والا کسی ایمان والے کو کسی کافر کے بدلے قتل نہ کرے گا اور نہ کسی کافر کی کسی ایمان والے کے خلاف مدد کرے گا۔

۱۴: اور خدا کا ذمہ ایک ہی ہے، ان (مسلمانوں میں) کا ادنیٰ ترین فرد بھی کسی کو پناہ دے کر سب پر پابندی عائد کر سکے گا اور ایمان والے باہم بھائی بھائی ہیں (ساری دنیا کے) لوگوں مقابل۔

۱۵: اور یہ کہ یہودیوں میں سے جو ہماری اتباع کرے گا تو اسے مدد اور مساوات حاصل ہو گی۔ نہ ان پر ظلم کیا جائے گا اور نہ ان کے خلاف کسی کو مدد دی جائے گی۔

۱۶: اور ایمان والوں کی صلح ایک ہی ہو گی۔ اللہ کی راہ میں لڑائی ہو تو

کوئی ایمان والا کسی دوسرے ایمان والے کو چھوڑ کر (دشمن سے) صلح نہیں کرے گا جب تک کہ (یہ صلح) ان سب کے لیے برابر اور یکساں نہ ہو۔

۱۷: اور ان تمام ٹکڑیوں کو جو ہمارے ہمراہ جنگ کریں باہم نوبت بہ نوبت چھٹی دلائی جائے گی۔

۱۸: اور ایمان والے باہم اس چیز کا انتقام لیں گے جو خدائی راہ میں ان کے خون کو پہنچے۔

۱۹: الف۔ اور بے شبہ متقی ایمان والے سب سے اچھے اور سب سے سیدھے راستے پر ہیں۔

ب۔ اور یہ کہ کوئی (مشرک) (غیر مسلم رعیت) قریش کی جان و مال کو کوئی پناہ نہ دے گا اور نہ اس سلسلے میں کسی مومن کے آڑے آئے گا۔

۲۰: اور جو شخص کسی مومن کو قتل کرے اور ثبوت پیش ہو تو اس سے قصاص لیا جائے گا بجز اس کے کہ مقتول کا ولی خون بہا پر راضی ہو جائے اور تمام ایمان والے اس کی تعمیل کے لیے اٹھیں گے اور اس کے سوا انہیں کوئی اور چیز جائز نہ ہو گی۔

۲۱: اور کسی ایسے ایمان والے کے لیے جو اس دستور العمل (صحیفہ) کے مندرجات (کی تعمیل) کا اقرار کر چکا اور خدا اور یوم آخرت پر ایمان لا چکا ہو، یہ بات جائز نہ ہو گی کہ کسی قاتل کو مدد یا پناہ دے گا تو قیامت کے دن اس پر خدا کی لعنت اور غضب نازل ہونگے اور اس سے کوئی رقم یا معاوضہ قبول نہ ہو گا۔

۲۲: اور یہ کہ جب کبھی تم میں کسی چیز کے متعلق اختلاف ہو تو اسے خدا اور محمد سے رجوع کیا جائے گا۔

۲۳: اور یہودی اس وقت تک مومنین کے ساتھ اخراجات برداشت کرتے رہیں جب تک وہ مل کر جنگ کرتے رہیں۔

۲۴: اور بنی عوف کے یہودی مومنین کے ساتھ، ایک سیاسی وحدت (یا امت) تسلیم کیے جاتے ہیں۔ یہودیوں کو ان کا دین اور مسلمانوں کو ان کا دین۔ موالی ہوں کہ اصل۔ ہاں جو ظلم یا عہد شکنی کا ارتکاب کرے تو اس کی ذات یا گھرانے کے سوائے کوئی مصیبت میں نہیں پڑے گا۔

۲۵: اور بنی النجار کے یہودیوں کو بھی وہی حقوق حاصل ہوں گے جو بنی عوف کے یہودیوں کو۔

۲۶: اور بنی الحارث کے یہودیوں کو وہی حقوق حاصل ہوں گے جو بنی عوف کے یہودیوں کو۔

۲۷: اور بنی ساعدہ کے یہودیوں کو بھی وہی حقوق حاصل ہو گے جو بنی عوف کے یہودیوں کو۔

۲۸: اور بنی جشم کے یہودیوں کو بھی وہی حقوق حاصل ہوں گے جو بنی عوف کے یہودیوں کو۔

۲۹: اور بنی الاوس کے یہودیوں کو بھی وہی حقوق حاصل ہوں گے جو بنی عوف کے یہودیوں کو۔

۳۰: اور بنی ثعلبہ کے یہودیوں کو بھی وہی حقوق حاصل ہوں گے جو بنی عوف کے یہودیوں کو، ہاں جو ظلم یا عہد شکنی کرے تو خود اس کی ذات

یا گھرانے کے سوائے کوئی مصیبت میں نہیں پڑے گا۔

۳۱: اور جفنہ جو (قبیلہ) ثعلبہ کی ایک شاخ ہے اسے بھی وہی حقوق حاصل ہوں گے جو اصل کو۔

۳۲: اور بنی الشطیبہ کو بھی وہی حقوق حاصل ہوں گے جو بنی عوف کے یہودیوں کو اور وفاشعاری ہو نہ کہ عہد شکنی۔

۳۳: اور ثعلبہ کے موالی کو بھی وہی حقوق حاصل ہوں گے جو اصل کو۔

۳۴: اور یہودیوں (قبائل) کی ذیلی شاخوں کو بھی وہی حقوق حاصل ہوں گے جو اصل کو۔

۳۵: الف۔ اور یہ کہ ان میں سے کوئی بھی محمد ﷺ کی اجازت کے بغیر (فوجی کارروائی کے لیے) نہیں نکلے گا۔

ب۔ اور کسی زخم کا بدلہ لینے میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالی جائے گی اور جو خونریزی کرے تو اس کی ذات اور اس کا گھرانہ ذمہ دار ہو گا ورنہ ظلم ہو گا اور خدا اس کے ساتھ ہے جو اس کی وفاشعاری سے تعمیل کرے۔

۳۶: الف۔ اور یہودیوں پر ان کے خرچے کا بار ہو گا اور مسلمانوں پر ان کے خرچے کا۔

ب۔ اور جو کوئی اس دستور والوں سے جنگ کرے تو ان (یہودیوں اور مسلمانوں) میں باہم امداد عمل میں آئے گی اور ان میں باہم حسن مشورہ اور بہی خواہی ہو گی اور وفاشعاری ہو گی نہ کہ عہد شکنی۔

۳۷: اور یہودی اس وقت تک مومنین کے ساتھ اخراجات برداشت کرتے رہیں گے جب تک کہ وہ مل کر جنگ کرتے رہیں۔

۳۸: اور یثرب کا جوف (یعنی میدان جو پہاڑوں سے گھرا ہوا ہو) اس دستور والوں کے لیے ایک حرم ہو گا۔

۳۹: پناہ گزین سے وہی برتاؤ ہو گا جو اصل (پناہ دہندہ) کے ساتھ۔ نہ اس کو ضرر پہنچایا جائے گا اور نہ خود وہ عہد شکنی کرے گا۔

۴۰: اور کسی پناہ گاہ میں وہاں والوں کی اجازت کے بغیر کسی کو پناہ نہیں دی جائے گی۔ (یعنی پناہ دینے کا حق پناہ گزین کو نہیں)۔

۴۱: اور یہ کہ اس دستور والوں میں جو کوئی قتل یا جھگڑا رونما ہو جس سے فساد کا ڈر ہو تو اسے خدا اور خدا کے رسول (حضرت) محمد (ﷺ) سے رجوع کیا جائے گا اور خدا اس شخص کے ساتھ ہے جو اس دستور کے مندرجات کی زیادہ سے زیادہ احتیاط اور زیادہ سے زیادہ وفاشعاری کے ساتھ تعمیل کرے۔

۴۲: اور قریش کو کوئی پناہ نہیں دی جائے گی اور نہ اس کو جو انہیں مدد دے۔

۴۳: اور ان (یہودیوں اور مسلمانوں) میں باہم مدد دہی ہو گی اگر کوئی یثرب پر ٹوٹ پڑے۔

۴۴: ہر گروہ کے حصے میں اسی رُخ کی مدافعت آئے گی جو اس کے بالمقابل ہو۔

۴۵: اور (قبیلہ) الاوس کے یہودیوں کو، موالی ہوں کہ اصل، وہی حقوق حاصل ہوں گے جو اس دستور والوں کو اور وہ بھی اس دستور والوں کے ساتھ خالص وفاشعاری کا برتاؤ کریں گے اور وفاشعاری ہو گی نہ کہ عہد شکنی۔ جو جیسا کرے گا ویسا خود ہی بھرے گا۔ اور خدا اس

کے ساتھ ہے جو اس دستور کے مندرجات کی زیادہ سے زیادہ صداقت اور وفاشعاری کے ساتھ تعمیل کرے۔

۴۶: اور یہ کہ یہ حکم نامہ کسی ظالم یا عہد شکن کے آڑے نہ آئے گا اور جو جنگ کو نکلے تو بھی امن کا مستحق ہو گا ورنہ ظلم اور عہد شکنی ہو گی اور خدا اس کے ساتھ ہے جو وفاشعاری اور احتیاط (سے تعمیل عہد) کرے اور اللہ کے رسول (حضرت) محمد (ﷺ) بھی جن پر خدا کی توجہ اور سلامتی ہو۔

تحویلِ قبلہ

سرورِ عالم ﷺ مکۃُ المکرمہ میں کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھا کرتے تھے۔ ہجرت کے بعد ارشاد خداوندی کے تحت بیت المقدس کی جانب منہ کر کے نمازیں پڑھتے رہے، لیکن سرورِ عالم ﷺ کی یہ خواہش تھی کہ ملت ابراہیمی کی طرح میرا قبلہ بھی ابراہیمی ہو۔ خداوندِ عالم نے حضور سرورِ عالم ﷺ کی خواہش کو پورا فرمایا اور آیت کریمہ نازل فرمائی:

قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ ۚ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰىهَا ۠ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۭ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ[60]

بے شک ہم دیکھتے ہیں تیرے منہ کا پھرنا آسمان کی طرف، پس ہم ضرور پھیریں گے تجھ کو اس قبلہ کی طرف کہ تو اسے پسند کرتا ہے۔ پس پھیر منہ اپنا مسجد حرام کی طرف اور جہاں کہیں ہو تم پس پھیرو منہ اپنے مسجد حرام کی طرف۔

---

60 البقرہ، ۱۴۴

واقعہ کی تفصیل یوں بیان کی جاتی ہے کہ سرورِ عالم ﷺ مسجد بنی سلمہ میں نماز پڑھا رہے تھے۔ تیسری رکعت کے رکوع میں تھے کہ تحویل قبلہ کی آیت نازل ہو گئی۔ چنانچہ آپ نے بحالت نماز ہی اپنا رخ کعبہ شریف کی جانب موڑ لیا، تمام مقتدیوں نے بھی اپنا رخ تبدیل کر لیا۔ اس مسجد کو اسی سبب سے مسجد قبلتین کہتے ہیں۔ اس واقعہ سے صحابہ کرامؓ کے اتباعِ رسول کا فقید المثال مظاہرہ ہوا۔ عین حالت نماز میں جب کہ کسی آیت کے نازل ہونے کی کوئی اطلاع نہیں تھی، سرور عالم ﷺ کے عمل کی متابعت میں اپنا رخ تبدیل کر لیا۔ صحابہ کرامؓ سرورِ عالم ﷺ کے ہر قول، فعل اور جملہ حرکات و سکنات کو دین سمجھتے تھے اور یہی وہ حقیقت ہے جس کی جانب علامہ اقبالؒ نے بڑا واضح اشارہ فرمایا ہے۔

بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دین ہمہ اوست
اگر باو نرسیدی تمام بولہبی ست

روزۂ رمضان کی فرضیت

اسی سال ۲ ہجری کو تحویل قبلہ کے ایک ماہ بعد شعبان میں رمضان کے روزوں کی فرضیت کا حکم نازل ہوا، یہ آنحضرت ﷺ کی مدینہ طیبہ میں تشریف آوری کے اٹھارہ ماہ بعد کا واقعہ ہے۔

نماز میں سلام و کلام کی ممانعت

شروع میں نماز کے دوران گفتگو کی ممانعت نہ تھی۔ اسی سال آیت کریمہ:
وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ [61] نازل ہوئی اور نماز میں خاموشی لازم قرار دے دی گئی۔

---

61 البقرہ، ۲۳۸

سب سے پہلی نمازِ عید الفطر

اسی سال یکم شوال کو آنحضرت ﷺ نے مسلمانوں کو سب سے پہلی نماز عید الفطر پڑھائی۔

عید الاضحیٰ اور قربانی

اسی سال ذی الحجہ میں آنحضرت ﷺ نے بقر عید کا دوگانہ ادا فرمایا۔ اسی سال قربانی کا حکم نازل ہوا۔ اور آنحضرت ﷺ نے نماز عید کے بعد دو مینڈھوں کو اپنے دستِ مبارک سے ذبح کیا اور پھر یہ قربانی آنحضرت ﷺ کا ہمیشہ کے لیے معمول رہا۔ ہر سال آپ دو مینڈھے قربانی دیا کرتے تھے۔ ایک اپنی جانب سے اور ایک پوری امت کی جانب سے۔

جہاد اور وجوہِ جہاد

جہاد۔۔۔ جہد بمعنی طاقت سے مشتق ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ اپنی طاقت کو مال و دولت کے لیے نہیں، کسی نسلی و قومی عصبیت کی بنیادوں پر نہیں، بلکہ محض اللہ کی رضا اور سرورِ عالم ﷺ کی خوشنودی کے لیے راہ خدا میں منکرین خدا سے جنگ کرنا اسلامی اصطلاح میں جہاد کہلاتا ہے۔

اولاً اس نقطۂ نظر کا اظہار ضروری سمجھتا ہوں کہ اسلام امن و آشتی کا دین ہے۔ وہ خونریزی کو پسند نہیں کرتا ہے، کسی ایک انسانی جان کے قاتل کو پوری انسانیت کا قاتل گردانتا ہے اور جس نے کسی ایک انسان کی جان بچائی، اسے پوری انسانیت کا محسن قرار دیتا ہے:

مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ أَوْ فَسَادٍ فِي الْأَرْضِ فَكَأَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيعًا ط

وَمَنْ اَحْیَاهَا فَکَاَنَّمَآ اَحْیَا النَّاسَ جَمِیْعًا[62]

جو شخص کسی کی جان لے بغیر اس کے کہ اس نے کسی کی جان لی ہو یا
زمین میں فساد کیا ہو تو گویا اس نے تمام انسانوں کا خون کیا اور جس نے
کسی کی جان بچائی تو گویا اس نے تمام انسانوں کو بچایا۔

ایک مرتبہ ایک شخص آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ سب سے بڑا گناہ کون سا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اَنْ تَدْعُوْا اللّٰهَ نِدًا وَهُوَ خَلَقَكَ. یہ کہ تو کسی کو اللہ کا نظیر و مثل قرار دے حالانکہ اس نے تجھے پیدا کیا۔ اس نے پھر پوچھا کہ اس کے بعد کونسا بڑا گناہ ہے؟ آپ نے جواب دیا، اِنْ تَقْتُلَ وَلَدَكَ اَنْ يُطْعِمَ مَعَكَ. یہ کہ تو اپنے بچے کو قتل کر دے اس خیال سے کہ وہ تیرے کھانے میں شریک ہو گا۔ اس نے عرض کیا کہ اس کے بعد کون سا گناہ ہے؟ آپ نے فرمایا: اَنْ تَزَانِيَ حِلِيكَ جَارُكَ. یہ کہ تو اپنے ہمسایہ کی بیوی سے زنا کرے۔[63]

یہ بتانا مقصود تھا کہ انسانی جان اللہ کے نزدیک بہت ہی محترم و مکرم ہے، چنانچہ اللہ اپنے بندوں کو بارہا تنبیہ فرماتا ہے کہ احترامِ انسانیت کو ہمیشہ ملحوظ نظر رکھو، مگر جس طرح اللہ رب العزت قتل کو جرم عظیم قرار دیتے ہیں اس سے کہیں زیادہ فتنہ و فساد کو۔ انسانی معاشرہ جس طرح بعض معاشرہ کے امن و امان کو تہ و بالا کرنے کی کوششوں کے جرم میں سزاوار قرار دیے جاتے ہیں اور حکومت وقت پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ ان کی سرکوبی کرے اور ان کے عمل کے موافق انہیں قرارِ واقعی سزا دے۔ اسی طرح اگر کوئی قوم نیکی اور صلاح و فلاح کے خلاف نبرد آزما ہو یا نیکی کے کاموں میں روڑے اٹکائے تو اس کے خلاف علَم

62 المائدہ ۳۲

63 الجہاد فی الاسلام، ابو الاعلیٰ مودودی، ص ۱۷

جہاد بلند کرنا عین عدل وانصاف ہے اور اسلام کا اصل الاصول ہے اور یہ واقعہ ہے کہ اگر حق پرستوں کو منکرینِ خدا کی سرکوبی کی اجازت نہ ہوتی تو دنیا کا امن تہ وبالا ہو جاتا۔ ایسی صورت حال کا نقشہ خود قرآن پاک بیان کرتا ہے:

وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا[64]

اگر خدا لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعے سے دفع نہ کرتا تو صومعے اور گرجے اور معبد اور مسجدیں جن میں اللہ کا ذکر کثرت سے کیا جاتا ہے، مسمار کر دیے جاتے۔

اور واقعہ یہ ہے کہ وہ لوگ جو اللہ کی حدود کو توڑ کر سرکشی کے مرتکب ہوتے ہیں، انہیں اللہ رب العزت مختلف طریقوں سے سزا دیتا ہے اور ان طریقوں میں سے ایک جہاد ہے۔

ارشادِ خداوندی ہے:

قَاتِلُوْهُمْ يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ بِاَيْدِيْكُمْ[65]

ان کافروں سے جہاد و قتال کرو تاکہ اللہ ان کو عذاب دے تمہارے ہاتھوں سے۔

سرورِ عالم ﷺ اور آپ کی امت کو جو جہاد کا حکم دیا گیا، وہ وسیع پس منظر کا حامل ہے جس کا ذکر گزشتہ صفحات میں مختلف عنوانات کے تحت آچکا ہے، حضور ﷺ کا مکہ میں اعلان حق اور قریش کے جور و ستم، سفر طائف والوں کا ناروا اور افسوسناک سلوک، داعی

---

64 الحج: ۴۰

65 التوبہ: ۱۴

اسلام ﷺ کی جان لینے کا ناپاک منصوبہ، آپ ﷺ پر ایمان لانے والوں کے ساتھ انسانیت سوز مظالم، یہ وہ تمام واقعات ہیں جو حکم جہاد سے پہلے رونما ہوئے۔ ہجرت مدینہ سے تاریخ اسلام ایک نئے دور میں داخل ہوئی، مدینے کے عرب قبائل اور یہودی قبائل نے آنحضرت ﷺ کی سرداری کو تسلیم کرلیا۔ تحریری معاہدے کیے گئے۔

بقول ڈاکٹر حمید اللہ: اس تنظیم اور خاموش تیاری میں کئی مہینے لگ گئے۔ اس کے بعد مدینے سے چھوٹی چھوٹی جماعتیں بھیج کر قریش کے کاروانوں کو حراساں کیا جانے لگا اور ان کو بتایا جانے لگا کہ اب انہیں اس اسلام کے زیر اثر علاقے سے گزرنا ہے تو سردار مدینہ کی اجازت ضروری ہے۔ قریش نے زور اور قوت کے ذریعے سے اپنا راستہ بنانا چاہا۔ اس کشمکش نے ان خونریزیوں اور لڑائیوں کی صورت اختیار کی۔

مدینۃ النبی ﷺ میں تشریف آوری کے دوسرے ہی سال اللہ رب العزت نے مومنین کو جہاد و قتال کی اجازت دے دی اور اس سلسلے میں قرآن کریم کی یہ آیت نازل ہوئی:

أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوا ۚ وَإِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ نَصْرِهِمْ لَقَدِيرٌ ۝ الَّذِينَ أُخْرِجُوا مِن دِيَارِهِم بِغَيْرِ حَقٍّ إِلَّا أَن يَقُولُوا رَبُّنَا اللَّهُ ۗ وَلَوْلَا دَفْعُ اللَّهِ النَّاسَ بَعْضَهُم بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَصَلَوَاتٌ وَمَسَاجِدُ يُذْكَرُ فِيهَا اسْمُ اللَّهِ كَثِيرًا ۗ وَلَيَنصُرَنَّ اللَّهُ مَن يَنصُرُهُ ۗ إِنَّ اللَّهَ لَقَوِيٌّ عَزِيزٌ ۝ الَّذِينَ إِن مَّكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَأَمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنكَرِ ۗ وَلِلَّهِ عَاقِبَةُ الْأُمُورِ [66]

ایسے لوگوں کو جہاد و قتال کی اجازت دی گئی ہے کہ جن سے کافر لڑتے

---

66 الحج: ۳۹-۴۱

ہیں، یہ اجازت اس لیے دی گئی کہ وہ لوگ بڑے مظلوم ہیں اور بے شک اللہ تعالیٰ ان کی مدد پر قادر ہے اور جن کی فتح ونصرت کا وعدہ کیا جارہاہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے گھروں سے بے وجہ نکالے گئے، فقط اس وجہ سے کہ یہ کہتے ہیں کہ ہمارا رب اللہ ہے اور اگر اللہ بعض کو بعض کے ذریعے نہ مٹاتا رہتا تو پہلے زمانے میں راہبوں کے خلوت خانے اور نصاریٰ اور یہود کے عبادت خانے اور مسجدیں جن میں کثرت سے اللہ کا نام لیا جاتا ہے سب منہدم ہو چکی ہوتیں اور بے شک اللہ تعالیٰ مدد کرے گا اس شخص کی جو اس کے دین کی مدد کرے گا، بے شک اللہ زبردست اور غالب ہے اور ہم ایسے لوگوں کی مدد کریں گے اگر ہم ان کو روئے زمین کی بادشاہت اور حکومت بھی دیں تو ہماری جادۂ اطاعت سے ذرہ برابر منحرف نہ ہوں گے۔ نمازوں کو قائم کریں گے اور زکوٰۃ دیں اور دوسروں کو نیکی کا حکم دیں گے اور برائی سے منع کریں گے اور تمام امور کے انجام کا اللہ ہی کو اختیار ہے۔

ان آیات کے ضمن میں مولانا ادریس کاندھلوی لکھتے ہیں:

ان آیتوں میں جہاد کی عام غرض وغایت کے علاوہ اس کی علت بھی بیان فرمائی کہ صحابہ کرام کو کیوں جہاد و قتال کی اجازت دی۔ وہ یہ کہ ان پر طرح طرح سے ظلم وزیادتی کی گئی اور بے قصور اور بلا وجہ اپنے گھروں سے نکال دیے گئے، صرف یہ کہنے پر کہ ہمارا پروردگار اللہ ہے۔[67]

67 سیرۃ المصطفیٰ۔ جلد دوم، ص ۱۲

اسلام امن وامان کے قیام اور خیر وصلاح کی ترویج واشاعت کے لیے مسلمانوں کو قتال کی اجازت دیتا ہے لیکن وہ ایمان کے بارے میں کسی پر جبر واکراہ کو جائز قرار نہیں دیتا بلکہ اس میں یہ عام اجازت ہے: فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ (جو چاہے اللہ پر ایمان لے آئے اور جو چاہے کفر کو اختیار کیے رکھے۔) ایمان کا تعلق دل سے ہے اور جبر واکراہ سے دل کی دنیا میں تبدیلی لانا ممکن نہیں، جبر واکراہ سے ظاہراً تو کسی کو مطیع وفرمانبردار بنایا جاسکتا ہے لیکن جب تک اس کا باطن نہیں جھکے گا وہ مومن نہیں ہو گا۔ ایسی حالت میں وہ منافق کہلائے گا۔

وہ لوگ جو اسلام پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ وہ تلوار کے زور سے پھیلا، ان کے پاس شاید بلکہ یقیناً کوئی جواب نہیں کہ صدیق اکبرؓ، فاروق اعظمؓ، عثمان غنیؓ اور علی المرتضیٰؓ اور وہ بے شمار مسلمان جنہوں نے طرح طرح کے مظالم برداشت کیے مگر حق کا ساتھ نہ چھوڑا کس تلوار کے زور سے ایمان لائے تھے۔ مکہ میں حضور ﷺ کے پاس کونسی عسکری قوت تھی جس نے ان لوگوں کو آپ کا مطیع وفرمانبردار بنادیا تھا۔

ہجرت سے قبل مسلمانوں نے ہجرتِ حبشہ کی، قبیلہ غفار مسلمان ہو گیا، نجاشی شاہِ حبشہ حضرت جعفر طیارؓ کی تقریر سن کر مسلمان ہو گیا۔ نجران اور شام کے نصاریٰ کو کس نے مجبور کیا تھا کہ وہ بارگاہ رسالت مآب میں حاضر ہو کر مشرف باسلام ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام سچے اصولوں اور سرورِ عالم ﷺ کے اخلاقِ حسنہ کے نتیجے میں پھیلا۔ اور یہ وہ چیز ہے جس کے لیے فطرت سلیمہ ہمیشہ متلاشی رہتی ہے۔ چنانچہ اس وقت بھی فطرت سلیم کے حاملین کے کانوں میں جب حق کی آواز پہنچی تو وہ آمنا وصدقنا کہہ کر حلقہ بگوش اسلام ہو گئے۔

غــزوات و سرایا

جہاد کا حکم نازل ہونے کے بعد اسلام اور کفر کے درمیان جنگوں کا سلسلہ جاری ہو گیا۔ مؤرخین نے ان جنگوں کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ "غزوات و سرایا" جس جنگ میں آنحضرت ﷺ بنفس نفیس شریک ہوئے اسے "غزوہ" کا نام دیا اور جس جنگ میں آپ شریک نہیں ہوئے اسے سرایا کے نام سے تاریخ میں رقم کیا۔ محققین نے غزوات و سرایا کی تعداد میں اختلاف کیا ہے، بعض نے غزوات کی تعداد انیس، بعض نے اکیس اور بعض نے چودہ بتائی ہے۔ اسی طرح سرایا کی تعداد سے متعلق بھی چند روایتیں ملتی ہیں مثلاً چالیس، پینتیس، اڑتیس، اور اڑتالیس۔ علامہ سہیل اس اختلاف کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ "بعض علماء نے چند غزوات کو قریب قریب اور ایک سفر میں ہونے کی وجہ سے ایک غزوہ شمار کیا، اس لیے ان کے نزدیک غزوات کی تعداد کم رہی۔ نیز یہ بھی ممکن ہے کہ بعض اصحاب کو بعض غزوات کا علم نہ ہوا ہو۔[68]

اختصار کے سبب صرف غزوات کی تفصیلات قلم بند کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

جنگِ بدر، عوامل اور نتائج

جنگ بدر کفر و اسلام کا پہلا عظیم معرکہ ہے، اس لیے اس کو "یومُ الفرقان" کا نام دیا گیا ہے۔ یہ جنگ کوئی امر اتفاقی نہ تھا بلکہ تاریخ پر معمولی نظر رکھنے والا شخص بھی یہ اندازہ کر سکتا ہے کہ جس قسم کے حالات پیدا ہو چکے تھے اس میں جنگ ناگزیر تھی۔ مکی زندگی میں کافروں نے داعیِ اسلام ﷺ اور دیگر مسلمانوں کو جس طرح تکالیف و مصائب سے دوچار

---

68 سیرۃ المصطفےٰ۔ جلد دوم، ص ۴۳

کیا، اس کی تفصیل گزشتہ صفحات میں گزر چکی ہے، بعد میں جب اذنِ الٰہی سے آپ ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہ کرامؓ نے اپنے گھروں کو خیر باد کہہ کر مدینہ منورہ میں جائے سکونت اختیار کی تو کافروں کو یہ بھی ناگوار گزرا۔ مسلمانوں کو گھروں سے نکال کر بھی انہیں اطمینان نصیب نہ ہوا اور وہ برابر سازشوں میں مصروف رہے۔ ادھر یہود جو پہلے ایک قبلہ ہونے کی بناء پر کسی حد تک مسلمانوں سے ملے ہوئے تھے، تحویلِ قبلہ کے بعد وہ بھی کھلم کھلا دشمنی پر آمادہ ہو گئے لیکن میثاقِ مدینہ کی وجہ سے مجبور تھے۔

دوسری جانب عبداللہ بن ابیّ بھی اپنی منافقت کے جال میں مسلمانوں کو پھنسانے کی ہر ممکن سازش میں مصروف تھا۔ اس شخص کو جو اسلام اور داعیِ اسلام سے دشمنی تھی، اس میں اس کی ذات کو بھی بہت دخل تھا۔ اس لیے کہ ہجرت سے پہلے یہ رئیسُ الانصار تھا اور انصار نے اس کی تاج پوشی کیلئے تاج تیار کر لیا تھا۔[69]

سید دوعالم ﷺ کی مدینہ تشریف آوری سے اس کا بنا بنایا کھیل ختم ہو گیا اور منافقت کے پردے میں مسلمانوں کے خلاف سازشوں میں مصروف ہو گیا۔ قریش مکہ نے بھی اس منافق کو خط لکھا کہ تم محمد ﷺ کو وہاں سے نکال دو ورنہ ہم مدینہ پر حملہ کر دیں گے۔ یہ قریش کی محض دھمکی نہیں تھی بلکہ وہ مدینہ پر حملہ کی تیاریوں میں برابر مصروف تھے، اور انہی خطرات کے پیشِ نظر حضور ﷺ اور آپ کے اصحاب ہتھیاروں سے لیس ہو کر سوتے تھے۔ آنحضرت ﷺ نے جملہ خطرات کے پیشِ نظر مدینہ اور اہل مدینہ کی حفاظت کے لیے مختلف تدابیر اختیار کیں اور فی الواقع یہ آپ کی ذمہ داری تھی، اس لیے کہ میثاق مدینہ کی رو سے مدینہ کے تمام قبائل آپ کی سیادت پر متفق ہو چکے تھے، چنانچہ اس سلسلے میں دو تدبیریں بہت موثر ثابت ہوئیں۔ اول تو آپ نے یہ فیصلہ فرمایا کہ قریش کی شامی

69 بخاری۔ جلد ۸، صفحہ ۹۶

تجارت کو روکا جائے اور یوں قریش کو سرنگوں کیا جائے تا کہ وہ اشاعتِ اسلام کے کام میں روڑے اٹکانے سے باز آ جائیں۔ اس سلسلے میں آپ نے مختلف اوقات میں حضرت حمزہؓ، حضرت عبیدہ بن حارثؓ اور حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کی سرکردگی میں مختلف جماعتیں بھیجیں لیکن جنگ کی نوبت نہ آئی۔ اس دوران مکہ کے ایک رئیس کرز بن جابر بن فہری نے مدینہ کی چراگاہ پر حملہ کیا اور کچھ مویشی ہانک کر لے گیا۔ مسلمانوں کو معلوم ہوا تو انہوں نے کرز کا پیچھا کیا۔ انہوں نے مویشی چھین لیے لیکن کرز بچ نکلا۔ اس کے بعد ایک اور واقعہ پیش آیا۔ حضور ﷺ نے عبد اللہ بن جحش کی قیادت میں ۱۲ر آدمیوں پر مشتمل ایک ٹیم کو قریش کے کاروانِ تجارت کی نقل و حرکت پر نظر رکھنے کے کام پر مامور کیا۔ یہ لوگ اپنے فرائض سرانجام دے رہے تھے کہ قریش کے ایک تجارتی قافلے سے ان کی مڈبھیڑ ہو گئی۔ عبد اللہ نے حملہ کر کے ایک شخص کو قتل کر دیا اور دو کو گرفتار کر لیا۔ آنحضرت ﷺ نے عبد اللہ کو صرف نقل و حرکت پر نظر رکھنے کے کام پر مامور کیا تھا، اس لیے ان کے اس عمل کو پسند نہیں فرمایا۔

بعض اہل علم قریشی قافلوں کو ہراساں کرنے کے لیے بھیجی جانے والی ان مہموں سے ہی انکار کرتے ہیں اور بہت ہی معذرت خواہانہ لہجہ اختیار کرتے ہیں۔ ان کی یہ بات اسی وقت درست ہوتی جب قریش بے قصور ہوتے اور ہراساں کرنے والے اشخاص ہوتے، حکومت نہ ہوتی۔ دو حکومتوں کے مابین تصادم کی صورت میں ہر فریق، فریق ثانی کو نقصان پہنچانے کا پورا حق رکھتا ہے اور ہر فریق کو یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ فریق مخالف کی مشکلات میں اضافہ کر کے اس کی کمر توڑے اور اپنے لیے کامیابی کی راہ پیدا کرے۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ نے دیگر مہمات کے علاوہ شعبان ۲ ہجری کو ایک اہم فیصلہ فرمایا۔ واقعہ کی تفصیل یہ ہے کہ قریش کا ایک بہت بڑا تجارتی قافلہ جس کے ساز و سامان کی مالیت تقریباً پچاس ہزار اشرفی تھی۔ شام سے مکہ واپس لوٹ رہا تھا۔ سرورِ عالم ﷺ کو جب اس قافلے کی اطلاع ملی

تو آپ نے صحابہ کرامؓ کو جمع فرما کر اس کی خبر دی اور ساتھ ہی اجازت مرحمت فرمائی کہ وہ اس قافلے کے لیے خروج کریں۔

ادھر سالارِ قافلہ ابو سفیان بھی پوری طرح چوکنا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ مسلمان اس کی راہ روکیں گے۔ وہ جہاں سے بھی گزرتا وہاں سے آپ کی سرگرمیوں سے متعلق معلومات حاصل کرتا۔ حتیٰ کہ اس کو یہ خبر مل گئی کہ آنحضرت ﷺ نے اپنے اصحاب کو قافلے پر حملہ کرنے کی اجازت دیدی ہے۔

آنحضرت ﷺ مدینہ سے روانہ ہو پڑے۔ آپ کا خیال تھا کہ بدر کے مقام پر وہ قافلے کو جالیں گے کیونکہ یہی وہ مقام ہے جو مکہ اور مدینہ کے راستوں کا قریب ترین اتصال ہے۔ بدر کے مقام پر جب آنحضرت ﷺ پہنچے تو آپ نے متعدد سانڈنی سوار بھیجے تاکہ پتہ چلائیں کہ قافلہ کہاں ہے۔ جو سوار شمال مغرب میں شام کے راستے پر بھیجے گئے تھے انہوں نے واپس آکر غالباً آنحضرت کو یہ اطلاع دی ہوگی کہ قافلہ آیا ہی چاہتا ہے۔[70]

ابو سفیان بدر پہنچنے سے پہلے آنحضرت ﷺ کی نقل و حرکت معلوم کرنے کے لیے نکلا۔ اس نے مختلف لوگوں سے معلومات حاصل کیں۔ لوگوں نے حضور ﷺ کے سانڈنی سواروں کے گزرنے کی تفصیلات اسے بتائیں۔ اس نے ان سانڈنیوں کی وہاں پر پڑی ہوئی مینگنیوں کو دیکھا اور فوراً معلوم کر لیا کہ وہ مدینہ کا چارہ کھائی ہوئی سانڈھنیاں تھیں۔ چنانچہ اس نے فوراً ایک شخص کو جس کا نام ضمضم غفاری تھا، اجرت پر حاصل کیا اور اسے مکہ روانہ کیا تاکہ وہ قافلے کو پیش آمدہ خطرے کی اطلاع اہل مکہ کو پہنچائے۔

ضمضم نے مکہ پہنچ کر اپنے اونٹ کے ناک، کان کاٹ دیے۔ اپنے کپڑے پھاڑ دیے اور یہ اعلان کرتا ہوا مکے میں داخل ہوا۔ اے گروہ قریش! قافلۂ تجارت! قافلۂ

---

70 طبری۔ ص، ۱۳۰۵

تجارت! تمہارا مال ابوسفیان کے ساتھ ہے۔ (حضرت) محمد (ﷺ) اور ان کے اصحاب اس کے سد راہ ہو گئے ہیں، میں خیال نہیں کرتا کہ تم اس کو بچا لو گے، فریاد! فریاد![71] اس قافلے میں تقریباً سبھی اہل مکہ کی رقوم شامل تھیں چنانچہ ضمضم کے اس اعلان سے مکہ میں اضطراب کی ایک لہر دوڑ گئی اور آناً فاناً مکہ کے نوجوان اور رؤسا جنگ کے لیے تیار ہو گئے اور کفار کا یہ لشکر بزعم خود اسلام کو مٹانے کے لیے چل نکلا۔ یہ لشکر نو سو پچاس آدمیوں پر مشتمل تھا۔ ان میں زیادہ تر قریش تھے۔ ان کے پاس دو سو گھوڑے اور بہت سے اونٹ تھے۔ جانثاران اسلام کا لشکر بھی مدینہ سے کوچ کر چکا تھا۔ اس میں صرف ۳۱۳ جانثار تھے۔ بے سروسامانی کا یہ عالم تھا کہ صرف دو گھوڑے اور ستر اونٹ تھے، سواریاں باری باری سوار ہونے کے لیے تقویم تھیں۔ یہاں تک کہ محسن انسانیت ﷺ کی سواری میں حضرت علیؓ اور جناب مرثدؓ شریک تھے۔ یہ تینوں باری باری سواری کرتے تھے۔ آپ کے دونوں ساتھیوں علیؓ اور مرثدؓ نے بارگاہ رسالت مآب میں عرض کیا، آپ اونٹ پر سفر جاری رکھیں، ہم آپ کے حصے کی پیادہ روی بھی طے کر لیں گے۔ آپ نے یہ سن کر جواباً ارشاد فرمایا:

تم دونوں مجھ سے زیادہ طاقت ور نہیں ہو۔ نہ میں اجر کے معاملے میں
تم دونوں سے زیادہ بے نیاز ہوں۔

صفواء کے مقام پر پہنچ کر آنحضرت ﷺ نے دو آدمیوں کو قریش سے متعلق معلومات حاصل کرنے کے لیے روانہ کیا۔ وادئ زفران میں یہ لوگ واپس حضور ﷺ کے پاس پہنچے اور اطلاع دی کہ قریش اپنے قافلے کی حفاظت کے لیے کوچ کر چکے ہیں۔ آنحضرت ﷺ نے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے مشورہ طلب کیا۔ مہاجرین و انصار نے بیک زبان آنحضرت ﷺ کے ہر فیصلے پر جان و مال نچھاور کرنے کی قسم کھائی۔

---

71 طبقات ابن سعد، جلد ۲ ص ۱۱

انصار میں سے حضرت سعد نے فرمایا:

ہم آپ پر ایمان لائے ہیں، آپ کی تصدیق کی ہے اور شہادت دی ہے کہ آپ جو کچھ لائے ہیں وہ تمام تر حق ہے، ہم نے آپ سے سمع وطاعت کا عہد کر رکھا ہے، جو ارشاد ہو گا سنیں گے، جو حکم ہو گا اسے بجالائیں گے، آپ بلا تامل اپنا ارادہ پورا کریں، ہم دل و جان سے آپ کا ساتھ دیں گے، اگر آپ سمندر کی طرف رخ کریں اور اس میں چھلانگ لگادیں تو ہم بھی چھلانگ لگادیں گے اور ہم میں سے کوئی آدمی بھی پیچھے نہیں رہے گا۔[72]

ابو سفیان نے خطرہ محسوس کرتے ہوئے مکہ کو پیغام بھیجنے کے ساتھ خود اپنا راستہ بھی تبدیل کر کے ساتھ ساتھ انتہائی تیزی سے سفر کرتے ہوئے مسلمانوں کی دست برد سے بچ نکلا۔ ابو سفیان کو جب اطمینان ہو گیا کہ اب مسلمانوں کی دسترس سے باہر ہے تو اس نے اہل مکہ کو خبر بھیجی کہ قافلہ بچ کر نکل آیا ہے، اب تم لوگوں کو آنے کی ضرورت نہیں، مکہ واپس چلے جاؤ۔

قافلہ کے بحفاظت نکل جانے کے بعد اس قریشی لشکر میں بھی اختلاف پیدا ہو گیا۔ بعض اس بات پر مصر تھے کہ اب مسلمانوں سے برسرِ پیکار ہونے کی ضرورت نہیں اور بعض ہر حال میں مسلمانوں سے ٹکر لینا ضروری سمجھتے تھے، اس گروہ کے قائد ابو جہل نے کہا:

خدا کی قسم! ہم بدر تک ضرور جائیں گے، ہم وہاں تین دن قیام کریں گے، اونٹ ذبح کریں گے، شراب کے جام لنڈھائیں گے، گانے والیوں کا گانا سنیں گے اور عرب ہماری شان و شوکت، ہماری اس

---

72 سیرۃ ابن ہشام، جلد ۲، ص ۲۷۶

یادگار جمعیت اور سفر کی کہانیاں بیان کیا کریں گے، اس کے بعد ہماری ساکھ قائم ہو جائے گی اور دھاک بیٹھ جائے گی۔[73]

سرورِ عالم ﷺ نے بدر کے مقام پر پہنچ کر بلحاظ جنگ مناسب جگہ پر پڑاؤ ڈالا۔ پانی پر قبضہ کیا اور اس بات کا خاص لحاظ رکھا کہ دن چڑھے تو سورج آنکھوں پر نہ آئے۔ لڑائی سے پہلی رات آپ نے بارگاہِ ایزدی میں گریہ وزاری کرتے ہوئے گذاری۔

حضرت علی کرم اللہ وجہ فرماتے ہیں: "بدر کی شب میں ہم میں سے کوئی ایسا نہ تھا جو سو نہ رہا ہو، سوائے آپ ﷺ کی ذات بابرکات کے، آپ ﷺ نے تمام رات نماز، دعا اور گریہ وزاری میں گزار دی اور اسی طرح صبح کر دی"۔[74]

حضرت انسؓ، حضرت فاروق اعظمؓ سے روایت کرتے ہیں کہ جنگ سے پہلی رات جناب رسول اللہ ﷺ ہم کو اپنے ساتھ لیے میدانِ کارزار کی جانب چل پڑے اور فرمانے لگے کہ آؤ میں تم کو اہل مکہ کی قتل گاہیں دکھاؤں، میدان میں پہنچ کر آپ ﷺ اشارہ فرما کر یہ کہتے کہ یہ فلاں کی قتل گاہ ہے، اور مقام قتل پر ہاتھ رکھ کر نام بنام آپ یہ ارشاد فرماتے تھے کہ یہ فلاں کا مقام قتل ہے۔ قسم ہے اس خدا کی جس نے آپ کو حق دے کر بھیجا کسی ایک نے بھی اس جگہ سے سرِ مُو تجاوز نہ کیا جہاں آپ ﷺ نے اپنے ہاتھ سے اس کے قتل کی

---

73 آنحضرت بحیثیت سپہ سالار، محمود خطاب شیت، ترجمہ رئیس احمد جعفری، ص۱۳۶

74 کنز الاعمال، جلد ۴، ص۹۹

طرف اشارہ فرمایا تھا۔[75]

لڑائی کے دن علی الصبح آنحضرت ﷺ نے مسلمانوں کی صف بندی کی۔ صف بندی کی تکمیل کے بعد آپ نے مختلف حصوں پر افسر مقرر کیے، اس عمل سے فراغت کے بعد آپ نے مسلم سپاہ سے خطاب فرمایا جس کالب لباب یہ ہے:

صفوں کو کسی صورت میں نہ توڑا جائے، میری اجازت کے بغیر جنگ کا آغاز نہ کیا جائے، دشمن دور ہو تو تیر چلا کر ضائع نہ کریں، زَد پر ہو تو تیر چلائے جائیں، زیادہ قریب ہو تو پتھروں سے حملہ کریں، اس سے بھی نزدیک ہو جائے تو نیزوں سے روکیں اور جب بالکل قریب آجائے تو تلوار چلائیں۔[76]

اس کے بعد آپ صحابہ کرامؓ کے ہمراہ ایک ٹیلے پر چڑھ گئے، جہاں سے میدان جنگ صاف نظر آتا تھا۔ اس ٹیلے پر آپ کی اجازت سے ایک جھونپڑی تیار کی گئی تھی، دوران جنگ آپ اسی میں موجود رہے۔

جنگ کا آغاز

عرب کے دستور کے مطابق سب سے پہلے عقبہ بن ربیعہ نے اپنے بھائی شیبہ بن ربیعہ اور اپنے بیٹے ولید کے ساتھ مبارزت طلب کی۔ لشکرِ اسلام میں سے تین انصاری مقابلے کے لیے نکلے لیکن عقبہ نے ان کے ساتھ لڑنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ:

يَا مُحَمَّدُ اخْرِجْ إِلَيْنَا أَكْفَائِنَا مِنْ قَوْمِنَا[77]

---

75 فتح الباری، جلد ۷، ص ۲۱۹

76 عہد نبوی کے میدان جنگ، صفحہ ۳۶

77 سیرۃ ابن ہشام، جلد ۲، صفحہ ۱۷

اے محمد! ہماری قوم میں سے ہمارے مقابلے کے لوگوں کو لڑنے کے لیے بھیجے۔

چنانچہ سرورِ عالم ﷺ کی اجازت سے علی شیر خداؓ، سیدنا حضرت حمزہؓ اور حضرت عبیدہؓ میدان میں نکلے۔ چہرے نقاب کی وجہ سے او جھل تھے۔ اس لیے عقبہ نے ان سے پوچھا تم کون ہو؟ جب متعارف ہوا تو کہنے لگا "نَعَمْ اَکْفَآءِ کِرَامٌ" (ہاں تم ہمارے برابر کے ہو اور محترم ہو)۔ مقابلہ شروع ہو گیا، عقبہ کے مقابلہ میں عبیدہؓ تھے، حمزہؓ نے شیبہ کا سامنا کیا اور جناب علی اور ولید بر سرپیکار ہوئے۔ جناب علیؓ اور حضرت حمزہؓ نے اپنے اپنے مد مقابل کو چند لمحوں میں واصل جہنم کر دیا۔ عُقبہ اور حضرت عبیدہؓ کا مقابلہ سخت اور لمبا ہوا، دونوں زخمی ہو گئے، حضرت علیؓ اور جناب حمزہ اپنے اپنے کام سے فراغت کے بعد حضرت عبیدہ کی مدد کو آپہنچے اور عقبہ کا کام تمام کر دیا۔

یہ جنگ تاریخ انسانیت کی ایک انوکھی جنگ تھی، ایک ہی برادری کے لوگوں کی تلواریں باہم ٹکرا رہی تھیں، باپ بیٹے سے لڑ رہا تھا، بھائی کی تلوار بھائی سے ٹکرا رہی تھی۔ الغرض تمام نسلی اور نسبی امتیازات مٹ چکے تھے۔ صرف کفر و اسلام کے امتیاز پر جنگ لڑی جا رہی تھی اور لشکر اسلام کا ہر شخص اس جذبہ اور لگن سے سرشار تھا کہ وہ مٹتا ہے تو مٹ جائے لیکن اسلام مٹنے نہ پائے، اسلام کا جھنڈا سرنگوں نہ ہو، آج جب وہ یہاں سے لوٹے تو مرتبۂ شہادت سے سرفراز ہو، یا غازی اسلام ہونے کی سعادت سے بہرہ ور ہو، یہی ایک جذبہ عام تھا جو لشکرِ اسلام کے ہر سپاہی کے دل میں موجزن تھا اور یہی وہ جذبہ تھا جس نے دو کمسن نوجوانوں کو یہ ہمت بخشی کہ وہ قریش کے سردار اور اسلام کے دشمن اعظم ابو جہل سے مقابلہ کے لیے سینہ سپر ہوئے۔ حضرت عبد الرحمن بن عوف فرماتے ہیں کہ میں بدر کے دن صف میں کھڑا تھا، اچانک نظر جو پڑی تو دیکھتا ہوں کہ میرے دائیں بائیں انصار کے دو نوجوان ہیں۔ ایک نے آہستہ سے کہا کہ اے چچا مجھے دکھاؤ کہ ابو جہل کون ہے، میں نے کہا

اے میرے بھتیجے! ابو جہل کو دیکھ کر کیا کرو گے، اس نوجوان نے کہا میں نے اللہ سے عہد کیا ہے کہ اگر ابو جہل کو دیکھ پاؤں تو قتل کر ڈالوں گا یا خود مارا جاؤں گا اس لیے کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ ابو جہل آنحضرت ﷺ کو سب و شتم کرتا ہے۔ قسم ہے اس ذات پاک کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے، اگر اس کو دیکھ پاؤں تو میرا سایہ اس کے سائے سے جدا نہ ہو گا یہاں تک کہ ہم میں سے جس کی موت پہلے مقدر ہو چکی ہے مر نہ جائے۔ اس کی یہ گفتگو سن کر میں نے اشارے سے انہیں ابو جہل دکھایا۔ سنتے ہی شکرے اور باز کی طرح ابو جہل کی جانب جھپٹے اور چند ہی لمحوں میں اسے جہنم رسید کر دیا۔[78] اسلام کے یہ بہادر سپوت معاذ اور معوذ تھے۔ آپ کے والد کا نام عفراء تھا۔

میدان کارزار پورے عروج پر تھا۔ کفر و اسلام کی تلواریں پوری قوت سے ٹکرا رہی تھیں، شہیدان اسلام دین حق کی خاطر دادِ شجاعت دے رہے تھے اور کفار اسلام کے ان عظیم فرزندوں کو ختم کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے تھے، آنحضرت ﷺ اپنے چھپر پر کھڑے میدان جنگ کے منظر کو ملاحظہ فرما رہے تھے، اچانک آنحضرت ﷺ کے پاک ہاتھ بارگاہ رب العزت میں بلند ہوئے اور آپ نے یہ التجا کی:

> اے اللہ تو نے مجھ سے جو وعدہ کیا ہے پورا فرما، اے اللہ مسلمانوں کی یہ جماعت ہلاک ہو گئی تو پھر تیری پرستش نہ ہو گی۔[79]

سرور عالم ﷺ کی دعائیں، صحابہ کرامؓ کی جان نثاری بارگاہ رب العزت میں اس قدر قبول ہوئی کہ ملائکہ کو حکمِ الٰہی ملا، وہ زمین پر اترے اور مسلمانوں کے ساتھ مل کر لشکر کفار سے برسرپیکار ہوئے۔ جنگ بدر میں فرشتوں کا نزول آیات قرآنیہ اور احادیث

---

78 طبقات ابن سعد، جلد ۲، صفحہ: ۱۷

79 زرقانی جلد اول، صفحہ: ۴۱۹

صحیحہ سے ثابت ہے۔ ارشاد خداوندی ہے:

اِذْ تَسْتَغِيْثُوْنَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ اَنِّيْ مُمِدُّكُمْ بِاَلْفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُرْدِفِيْنَ [80]

جب تم اپنے رب سے فریاد کرتے تھے تو اس نے تمہاری سن لی کہ میں تمہیں مدد دینے والا ہوں، ہزاروں فرشتوں کی قطار سے۔

كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةً ۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ [81]

بارہا کم جماعت غالب آئی ہے زیادہ گروہ پر اللہ کے حکم سے۔

بلاشبہ مسلمانوں کی یہ کامیابی ان کے غیر متزلزل ایمان کا نتیجہ تھی۔ وہ سمع و طاعت کے جذبے سے سرشار تھے، وہ اپنی جان، مال اولاد سب سے زیادہ ایمان کو محبوب رکھتے تھے۔ ان کا ایمان تھا کہ جان خداوندی عطیہ ہے۔ اس لیے وہ ہر دم اس جذبے سے سرشار تھے۔

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

اصحابِ بدر نے بارگاہ ایزدی میں بہت ہی بلند مرتبہ پایا ہے، یہ وہ خوش قسمت لوگ ہیں جنہیں آنحضرت ﷺ نے دنیا میں ہی جنت کی بشارت دی۔ ارشاد رسالت مآب ﷺ ہے:

بے شک اللہ اہل بدر سے واقف ہے کیونکہ اس نے فرمادیا تم عمل کرو جو چاہو، البتہ تمہارے واسطے جنت ثابت ہو چکی یا تحقیق میں نے

80 الانفال،۹

81 البقرہ،۲۴۹

تمہیں بخش دیا۔[82]

بدر کی جنگ نے عربوں کے دلوں میں اسلامی طاقت کی اہمیت واضح کر دی۔ اس جنگ میں مشرکین مکہ کو بھاری جانی ومالی نقصان برداشت کرنا پڑا۔ ان کے ستر آدمی قتل کیے گئے، جن میں ان کے نامور رؤسا شامل تھے۔ مثلاً شیبہ، عقبہ، ابو جہل، ابوالبختری، زمعہ بن اسود، امیہ بن خلف اسی جنگ میں واصل جہنم ہوئے۔ قریش کے ستر آدمیوں کو مسلمانوں نے قیدی بنایا۔ ان میں بھی مشاہیر قریش شامل تھے۔ مثلاً حضرت عباسؓ، عقیل، نوفل، اسود، عبد بن زمعہ وغیرہ۔

آنحضرت ﷺ نے قیدیوں کے ساتھ جس حسن سلوک کا مظاہرہ کیا وہ بھی آپ کی رحمۃ للعالمینی کا عظیم مظہر ہے۔ آنحضرت ﷺ نے تمام قیدیوں کو صحابہ میں تقسیم کر دیا اور انہیں آرام سے رکھنے کا حکم دیا۔ اس حکم کی تعمیل صحابہ کرام نے اس طرح کی کہ خود کھجور کھا کر گزارہ کر لیتے اور قیدیوں کو کھانا کھلاتے۔[83] آنحضرت ﷺ نے اسیران جنگ کے متعلق صحابہ کرام سے مشورہ طلب کیا کہ ان کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے، حضرت عمرؓ کی رائے یہ تھی کہ انہیں قتل کر دیا جائے اور اس کا طریق کار یہ ہو کہ مسلمان قیدیوں میں سے اپنے اپنے اعزہ کو خود اپنے ہاتھوں سے قتل کریں۔ حضرت صدیق اکبرؓ نے فدیہ لے کر چھوڑ دینے کی رائے دی۔ آنحضرت ﷺ نے صدیق اکبرؓ کی رائے پر عمل کیا اور فدیہ لے کر سب کو رہا کر دیا۔ جو لوگ مفلسی کی وجہ سے فدیہ دینے کی استطاعت نہیں رکھتے تھے، انہیں فرمایا گیا کہ دس دس مسلمان بچوں کو لکھنا سکھا دیں تو رہا کر دیے جائیں

---

82 بخاری شریف، باب فضل من شہد اء بدر

83 طبری، صفحہ: ۱۳۳۸

گے۔[84] حضور ﷺ کے اس ارشاد سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو تعلیم کس قدر عزیز تھی۔ آنحضرت ﷺ امت محمدیہ کو تعلیم کے زیور سے آراستہ دیکھنا چاہتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ لکھنا سکھانے کو بھی آپ نے فدیہ میں شامل کر لیا۔

ابو سفیان کی مدینہ میں خفیہ آمد

جیسے کہ جنگِ بدر میں لکھا جا چکا ہے کہ میدان بدر میں مشرکینِ مکہ کے بڑے بڑے رؤسا قتل کر دیے گئے تھے، چنانچہ رؤسا مکہ میں سے صرف ابو سفیان بچا تھا جو اس جنگ میں شریک نہیں ہوا تھا، اب قریش کی سیادت اس کے ہاتھوں میں آگئی تھی اور اس کے دل میں مسلمانوں کے خلاف انتقام کے شعلے بھڑک رہے تھے، اس کی یہی تمنا تھی کہ ہر صورت میں مسلمانوں سے بدلہ کیا جائے۔ حتیٰ کہ اس نے قسم کھائی کہ جب تک وہ بدر کے مقتولین کا انتقام نہیں لے گا اس وقت تک سر میں تیل نہیں لگائے گا۔ اپنی قسم پوری کرنے کے لیے وہ دو سو سواروں کے دستے کے ساتھ خفیہ طور پر مدینہ پہنچا۔ بنو نضیر کے سردار سلام بن مشکم یہودی کے ہاں قیام کیا۔ ابو سفیان جب مسلمانوں کے جملہ حالات سے باخبر ہوا تو اسے حملہ کرنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ رات کے پچھلے پہر واپس مکہ کو روانہ ہو گیا۔ راستے میں مسلمانوں کے ایک نخلستان کو تاراج کیا اور ایک انصاری مسلمان کو بھی شہید کیا۔ آنحضرت ﷺ کو واقعے کی اطلاع ملی تو آپ نے تعاقب کیا۔ ابو سفیان بہت تیزی سے بھاگا اور اپنے ساتھ لائے ہوئے ستو کے تھیلے بھی پھینکتا گیا، جو تعاقب کرنے والے مسلمانوں کے ہاتھ لگے، بعد میں یہ غزوہ اسی وجہ سے غزوۂ سویق (ستوؤں والی لڑائی) کے نام سے مشہور ہوا۔

---

84 مسند احمد بن حنبل، جلد اول، صفحہ ۲۴۶

سیّدہ فاطمۃُ الزہراء کا نکاح

اسی سال ۲ھ کو سیدہ فاطمۃُ الزہراء کا نکاح حضرت علی المرتضٰی سے ہوا۔ سید دوعالم ﷺ نے ایک سو پچیس درہم مہر مقرر کیا اور ایک چارپائی، چمڑے کا گدا، ایک مشکیزہ، دو چکیاں اور دو مٹی کے گھڑے جہیز میں دیے۔

متفرق واقعات

۱۔ غزوہ غطفان: محرم الحرام ۳ھ کو اس غزوہ کے لیے آپ چار سو پچاس صحابہ کے ہمراہ روانہ ہوئے، مدینہ طیبہ میں حضرت عثمان غنیؓ کو اپنا نائب مقرر فرمایا، اس غزوہ میں جنگ و جدال کی نوبت نہیں آئی۔

۲۔ غزوہ نجران: ربیع الثانی ۳ھ میں بنی سلیم کے مقابلے کے لیے بجانب نجران روانہ ہوئے۔ وہ لوگ آپ کی آمد کی اطلاع پاتے ہی بھاگ کھڑے ہوئے اور جنگ کی نوبت نہیں آئی۔

۳۔ قتل کعب بن اشرف: کعب بن اشرف وہ مشہور یہودی ہے جو آنحضرت ﷺ کی شانِ اقدس میں توہین آمیز شعر کہتا تھا اور مسلمان عورتوں کے متعلق بدکلامی کرتا تھا۔ یہی وہ یہودی ہے جس نے آنحضرت ﷺ کو ختم کرنے کا ناپاک منصوبہ بنایا تھا۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ کی اجازت سے محمد بن مسلمہ، ابو نائلہ اور ان کے ساتھیوں نے رات کی تاریکی میں اسے قتل کر دیا، اس واقعہ سے یہود میں بہت سراسیمگی پھیل گئی اور انہوں نے آنحضرت ﷺ سے یہ معاہدہ طے کیا کہ آئندہ کوئی یہودی اس قسم کی حرکات کا مرتکب نہیں ہو گا۔

۴۔ قتل ابی رافع: ابو رافع بھی ایک مالدار یہودی تھا اور بدگوئی میں بھی کعب بن اشرف سے کم نہیں تھا۔ اس لیے قبیلۂ خزرج والے آنحضرت ﷺ کی بارگاہ میں حاضر

ہوئے اور دوسرے دشمنِ رسول کے قتل کی اجازت چاہی۔ عبد اللہ بن عتیق، مسعود بن سنان، عبداللہ بن انیس، اور ابو قتادہ رضی اللہ عنہم وغیرہ اس کام پر مامور کیے گئے۔ یہ لوگ خیبر میں واقع ابو رافع کے قلعے پر پہنچے۔ عبداللہ بن عتیق چوکیدار کی آنکھوں میں دھول جھونک کر قلعہ میں داخل ہو گئے اور ابو رافع کو قتل کر دیا۔ واپسی پر سیڑھیوں سے اترتے ہوئے گر پڑے اور شدید چوٹ لگی اور پنڈلی کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ بارگاہ رسالت مآب میں حاضر ہو کر قتلِ ابو رافع کا قصہ بیان کیا اور اپنی تکلیف کا بھی اظہار کیا۔ رحمۃ للعالمین ﷺ نے دست مبارک پنڈلی پر پھیرا۔ عبداللہ بن عتیق کہتے ہیں "مجھے ایسا معلوم ہوا گویا کبھی کوئی شکایت تھی ہی نہیں"۔[85]

جنگِ احد، عوامل ونتائج

بدر کی شکست نے قریش میں انتقام کی آگ بھڑکا دی تھی۔ قدرت نے انہیں وہ دن دکھایا کہ وہی بے کس و بے بس لوگ جنہیں ان ظالموں نے گھروں سے بے گھر کر دیا تھا۔ آج ان مغرور انسانوں کو انہی کی تلواروں سے ہزیمت اٹھانی پڑی تھی۔ ان کے بڑے بڑے سردار میدان بدر کی نذر ہو گئے تھے۔ عرب پر ان کی سیادت واحدہ کا تصور خاک میں مل گیا تھا، میدان بدر میں نہتے مسلمانوں نے انہیں چھٹی کا دودھ یاد دلایا تھا کفر و اسلام کے اس عظیم معرکے میں پرستاران اسلام نے کفار پر واضح کر دیا تھا کہ اب اسلام پھلے پھولے گا، بڑھے گا اور پوری رفتار سے بڑھے گا اور وہ دن دور نہیں جب غازیان اسلام کا لشکر مکہ کا رخ کرے گا۔

الغرض باقی ماندہ سردارانِ قریش نے بدر سے واپسی پر ایک بھرپور حملے کی

---

85 بخاری شریف۔ جلد ۷، صفحہ ۲۶۳

تیاریاں شروع کر دیں۔ قافلہ ابو سفیان کا تمام تجارتی منافع جنگ کے لیے وقف کر دیا گیا۔ مختلف قبائل میں سفیروں کو بھیجا گیا تاکہ وہ بھی اس جنگ میں شامل ہوں۔ اس جنگ کے لیے ایک زبردست پروپیگنڈہ مہم شروع کی گئی۔ اور اس طرح تقریباً تین سو شتر سوار، دو سو گھڑ سوار اور سات سو زرہ پوش جو پیادہ تھے، شوال ۳ھ کو بدر کا انتقام لینے کے لیے پوری دھوم دھام سے عازمِ مدینہ ہوئے۔

حضرت عباس نے اسلام قبول کر لیا تھا مگر تاحال مکہ ہی میں مقیم تھے۔ آپؓ نے تمام احوال کی خبر آنحضرت ﷺ کو ایک پیغام رساں کے ذریعے پہنچائی۔ آپ ﷺ نے دو آدمیوں کو روانہ کیا کہ وہ قریش کی نقل و حرکت معلوم کریں۔ ان دو اصحاب نے واپس آکر بتایا کہ لشکرِ قریش مدینہ کے قرب میں واقع چراگاہ "عریض" میں اتر چکا ہے۔ اس خبر کی وصولی کے دوسرے روز آپ ﷺ نے مجلس مشاورت طلب کی۔ آنحضرت ﷺ نے لشکرِ قریش کی روانگی اور مدینہ طیبہ کے قُرب میں ان کے پہنچ جانے کی خبر سے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو آگاہ کیا۔ آنحضرت ﷺ کی ذاتی خواہش تھی کہ مدینہ کے اندر رہتے ہوئے دشمن کا مقابلہ کیا جائے۔ بعض مقتدر صحابہ کرام کی بھی یہی رائے تھی، لیکن نوجوان صحابہ کرامؓ کے قلوب میں جذبۂ شہادت انگڑائیاں لے رہا تھا۔ وہ مصر تھے کہ مدینہ سے باہر نکل کر کفار کے ساتھ نبرد آزما ہوا جائے۔ آنحضرت ﷺ نے نوجوانوں کی اس پاکیزہ خواہش کو قبول فرمایا، چنانچہ ایک ہزار سپاہ پر مشتمل فوج تیار کر کے آپ احد کی طرف روانہ ہوئے۔ اس فوج میں رئیس المنافقین عبد اللہ بن ابیّ اپنے تین سو ساتھیوں سمیت شریک تھا۔ یہ شخص راستے ہی سے اپنی منافقت کا مظاہرہ کرتے ہوئے واپس چلا آیا اور اس طرح مسلم سپاہ کی تعداد صرف سات سو رہ گئی۔

احد کے مقام پر پہنچ کر آپ نے جنگی حکمت عملی کے تحت عبد اللہ بن جبیرؓ کی سرکردگی میں پچاس تیر اندازوں کا ایک دستہ اس درے میں متعین کیا جہاں سے دشمن کسی

بھی وقت حملہ کر سکتا تھا۔ آنحضرت ﷺ نے اس دستے کو حکم دیا کہ ہمیں کسی بھی صورت سے دوچار ہونا پڑے، تم اس درے سے نہیں ہٹو گے۔

جنگ کا آغاز ہوتا ہے۔ حسب دستور پہلے انفرادی مقابلے ہوتے ہیں پھر جنگ بھرپور انداز میں شروع ہوتی ہے۔ حضرت حمزہ، حضرت علی اور ابو دجانہ انصاری جن کو سرورِ عالم ﷺ نے اپنی تلوار عطا فرما کر اعزاز بخشا تھا، بہت بہادر نوجوان تھے۔ لڑائی میں ان پر عجب کیفیت طاری ہوتی تھی۔ سر پر سرخ عمامہ باندھ کر میدان میں اکڑ اکڑ کر چلتے، احد میں بھی اسی شان سے نکلے۔ اس وقت ان کی زبان پر یہ اشعار تھے:

اَنَا الَّذِیْ عَاھِدِ فِیْ خَلِیْلِیْ

وَ نَحْنُ بِالسَّفْحِ لَدَی النَّخِیْلِیْ

میں وہی ہوں جس سے میرے اس دوست نے عہد لیا ہے (جس کی محبت میرے دل کی گہرائیوں میں سرایت کر چکی ہے یعنی محمد ﷺ)

دراں حالیکہ ہم پہاڑ کے دامن میں نخلستان کے قریب تھے۔

اَنْ لَاَ اَقُوَامُ الدَّھْرِ فِیْ الْکَیُوْلِ

اَضْرِبُ بِسَیْفِ اللّٰہِ وَالرَّسُوْلِ

وہ عہد کہ کبھی پیچھے کی صف میں کھڑا نہ ہوں گا اور اللہ اور رسول کی تلوار سے خدا کے دشمنوں کو مارتا رہوں گا۔

لشکرِ کفار میں دیگر کفار خواتین کے ساتھ ابو سفیان کی بیوی ہندہ بھی شریکِ سفر تھی اور وہ اپنے باپ عتبہ (جو جنگِ بدر میں قتل ہوا) کا انتقام لینا چاہتی تھی۔ اسی غرض سے وہ وحشی نامی غلام کو اپنے ساتھ لائی تھی۔ وحشی نے چھپ کر حضرت حمزہؓ پر نیزے سے وار کیا جس سے آپ کی شہادت واقع ہوئی۔ ہندہ نے انتہائی بربریت کا مظاہرہ کرتے ہوئے

"حضرت حمزہؓ کا سینہ چاک کر کے کلیجہ نکال کر چبایا اور ناک، کان کاٹ دیے"۔[86] فتح مکہ کے بعد یہی وحشی طائف کے وفد کے ساتھ بارگاہ رسالت مآب ﷺ میں حاضر ہوئے۔ رحمۃ للعالمین، عفوو درگزر کے بے مثال شاہکار سرور عالم ﷺ نے معاف کر دیا اور فرمایا:

> اس کو چھوڑ دو، ایک شخص کا مسلمان ہونا میرے نزدیک ہزار کافروں کے قتل سے کہیں زیادہ بہتر ہے۔[87]

الغرض مسلمان سپاہ بڑی جوانمردی سے کفار کے مقابلے میں لڑی جس سے ان کے قدم اکھڑ گئے۔ خواتین قریش نے انہیں طعنے دیے اور بھڑکانے کی کوشش کی مگر خود قریش کی عورتوں نے جب مسلمانوں کی بہادرانہ جنگ کا منظر دیکھا تو پیچھے بھاگیں اور اس کے ساتھ ہی لشکرِ کفار بھی پسپا ہونا شروع ہو گیا۔ جنگی حکمتِ عملی کا تقاضا تو یہ تھا کہ مسلمان لشکر کا پیچھا کرتے مگر انہوں نے مالِ غنیمت اکٹھا کرنا شروع کر دیا۔ ادھر عبداللہ بن جبیرؓ کی سرکردگی میں متعین دستے نے جب دیکھا کہ مسلمان مالِ غنیمت اکٹھا کر رہے ہیں تو اکثر و بیشتر لوگ مالِ غنیمت کے حصول کے لیے اپنی جگہ سے ہٹ گئے، اور پیچھے صرف دس آدمی عبداللہ بن جبیرؓ کی قیادت میں بچے۔ خالد بن ولید (ابھی مسلمان نہیں ہوئے تھے) نے موقعہ پاتے ہی اس درے سے حملہ کیا۔ عبداللہ بن جبیرؓ اور آپ کے ساتھیوں نے بڑی جرأت رندانہ سے مقابلہ کیا اور بالآخر جامِ شہادت نوش کیا۔ خالد بن ولید آگے بڑھے اور مالِ غنیمت میں منہمک مسلمانوں پر زور دار حملہ کیا۔ قریش نے بھی یہ صورت دیکھی تو پلٹ کر دوبارہ حملہ آور ہوئے۔ اب مسلمانوں کو دو طرفہ دشمن کا سامنا تھا، ان پر عجب بدحواسی کی کیفیت طاری ہو گئی اور لشکرِ کفر پھر سے جم گیا۔ اسی اثناء میں مصعب بن عمیرؓ جن کی صورت

---

86 سیرت ابن ہشام، جلد ۲، صفحہ ۷۴

87 ایضاً

آنحضرت ﷺ سے بہت مشابہ تھی، شہادت سے سرفراز ہوئے۔ اس سے پورے لشکر میں یہ افواہ پھیل گئی کہ آنحضرت ﷺ شہید ہو گئے ہیں۔ اس خبر نے مسلمانوں کو ہراساں کر دیا۔ ان کی صفیں ٹوٹ گئیں اور دل شکستگی کے عالم میں کئی بھاگ کھڑے ہوئے۔

آنحضرت ﷺ پوری دل جمعی کے ساتھ ابھی تک میدان جہاد میں موجود تھے، کعب بن مالکؓ نے اچانک آپ کو دیکھ لیا اور پوری قوت سے پکارے "مسلمانو! رسول اللہ ﷺ ادھر ہیں"۔ یہ سن کر جان نثارانِ مصطفیٰ چاروں طرف سے دیوانہ وار آپ کی طرف لپکے، کفار بھی آنحضرت ﷺ تک پہنچنے کے لیے مسلسل حملے کر رہے تھے۔ جب کفار کا آپ پر بہت زیادہ ہجوم ہو گیا تو ارشاد فرمایا "کون ہے جو ان کو مجھ سے ہٹائے اور جنت میں میرا رفیق بنے"، سات انصاری اس ارشاد پر لبیک کہتے ہوئے بڑھے اور اپنے آقا پر جاں نثار ہو گئے"[۸۸]

عبداللہ بن قمیہ مشہور قریشی پہلوان نے حملہ کر کے آپ کے رخسار مبارک کو زخمی کر دیا اور عبداللہ بن شہاب زہری نے آپ کی پیشانی اقدس پر پتھر مارا، جس سے خون بہ نکلا۔ کفار حضور اقدس ﷺ پر حملے کر رہے تھے، تیر برسا رہے تھے اور ابودجانہؓ سرورِ عالم ﷺ کے سامنے کھڑے ہو کر اپنی پیٹھ پر تیر روک رہے تھے۔ مخالفین نے تلوار کے وار کیے تو حضرت طلحہؓ نے اپنے ہاتھ پر روکے۔

اس ساری کیفیت کو سامنے رکھ کر سرورِ عالم ﷺ کے جذبات کا اندازہ لگایئے، اس وقت بھی دو جہانوں کے لیے اس سراپا رحمت کی زبان پر یہی الفاظ تھے "خدایا میری قوم کو بخش دے، وہ جانتے نہیں"۔[۸۹]

---

88 صحیح مسلم، جلد ۲، صفحہ ۱۰۷

89 صحیح مسلم، جلد ۲، ص ۱۰۸

آنحضرت ﷺ کی شہادت کی خبر مشرکین میں بھی پھیل گئی تھی، تصدیق کے لیے ابو سفیان نے پکار کر پوچھا۔ کیا محمد (ﷺ) زندہ ہیں؟ آنحضرت ﷺ نے جواب دینے سے روک دیا۔ اس نے جواب نہ پا کر پوچھا، کیا ابو بکر زندہ ہے، کیا عمر زندہ ہے۔ جب کوئی جواب نہ ملا تو عالم مسرت میں کہا کہ سب مارے گئے۔ اس موقع پر فاروق اعظمؓ ضبط نہ کر سکے اور پکار کر کہا: اے دشمن خدا ہم سب زندہ ہیں۔

قریش مکہ کو معلوم تھا کہ ان کی آج کی فتح ایک اتفاقی امر تھا۔ انہوں نے مسلمانوں کی ایک غلطی سے فائدہ اٹھایا ہے اس لیے انہیں مدینہ پر حملے کی ہمت نہ ہوئی۔ آنحضرت ﷺ نے اس خطرے کے پیش نظر کہ مبادا یہ لوگ مدینہ پر حملہ آور ہوں، ستر آدمیوں کو ان کے تعاقب کے لیے بھیجا، خود بھی سرور عالم ﷺ باقی صحابہ کو جمع فرما کر مدینہ سے آٹھ میل دور حمراء تک تشریف لے آئے۔ سرور عالم ﷺ کا خیال درست نکلا، ابو سفیان روحاء کے مقام پر پہنچا تو اس کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ مدینہ پر حملہ آور ہونے کے لیے یہ بہترین موقعہ ہے لہٰذا آج اسلام کے ان جان نثاروں کا خاتمہ کر ہی دینا چاہیے لیکن قبیلہ خزاع کا رئیس جو حضور ﷺ سے مل کر آیا تھا اس نے ابو سفیان کو بتایا کہ محمد (ﷺ) اپنے مضبوط ارادے اور قوت سے چلے آ رہے ہیں اور اب ان سے مقابلہ ناممکن ہے، چنانچہ وہ واپس چلا گیا۔

دینِ حق کے پرستاروں نے ہر جنگ میں جاں بازی کا جو مظاہرہ کیا وہ تاریخ عالم کا ایک انوکھا باب ہے۔ اس جنگ میں صحابہ کرام نے اور پھر شہداء کے پس ماندگان نے جس صبر جمیل کا مظاہرہ کیا وہ بھی قابلِ رشک ہے۔ جنگ احد میں ایک انصاری خاتون کا باپ، بھائی اور شوہر شہید ہو گئے، اسے باری باری ان تینوں کی شہادت کی خبر ملی، مگر وہ ہر مرتبہ پوچھتی تھی کہ آنحضرت ﷺ کیسے ہیں۔ لوگوں نے جب اسے بتایا کہ آپ بخیریت ہیں تو اس نے چہرۂ رسول کی زیارت کی اور محبت بھرے یہ الفاظ کہے:

کُلُ مُصِیْبَۃٍ بَعْدکَ جَلَاَل [90]

تیرے ہوتے ہوئے سب مصیبتیں ہیچ ہیں

غزوۂ احد کے ضمن میں حضرت حنظلہؓ کی اطاعت رسول اور شوقِ شہادت کا ذکر بھی بہت ضروری ہے۔ حضرت حنظلہؓ کی جس دن شادی ہوئی، اس سے دوسرے روز حضور ﷺ جنگ احد کے لیے روانہ ہوئے۔ حکمِ جہاد ملتے ہی حضرت حنظلہؓ بھی ہمرکابیٔ رسالت مآب سے مشرف ہوئے۔ اس جنگ میں حضرت حنظلہؓ شہید ہوئے، لوگوں نے دیکھا کہ ان کے بدن سے پانی کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ میں نے فرشتوں کو دیکھا کہ حنظلہ کو غسل دے رہے ہیں۔ بعد میں ان کی زوجۂ محترمہ سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ حنظلہؓ حالت جنابت میں ہی جہاد کے لیے روانہ ہو گئے تھے۔ [91] حضرت حنظلہؓ فرشتوں کے غسل دینے کی وجہ سے "غسیل الملائکہ" کے لقب سے مشہور ہوئے۔

اس غزوہ میں مسلمانوں کو ہزیمت اٹھانی پڑی، ستر صحابہ کرام شہید ہوئے۔ ان میں اکثریت انصار کی تھی۔ مسلمانوں کی معمولی سی غفلت آنحضرت کے حکم کی خلاف ورزی (درے کو خالی چھوڑدینا) سے ان کی فتح آنِ واحد میں شکست میں تبدیل ہو گئی۔ اسی احد کے معرکے کے سلسلے میں سُورۂ انفال کی ساٹھ آیتیں نازل ہوئیں، جن میں مسلمانوں کی شکست کے اسباب و علل پر واضح اشارات موجود ہیں۔

غزوۂ بنو قینقاع

یہود کی مسلم دشمنی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں تھی اور مسلمان بھی ان کے ناپاک ارادوں سے بخوبی واقف تھے لیکن اس غزوہ کے وقوع کے لیے ایک خاص واقعہ سبب بنا جس

---

90 طبری۔ جلد ۱، صفحہ ۱۴۲۱

91 خصائص کبریٰ، جلد، صفحہ ۲۱۶

کی تفصیل یہ ہے کہ ایک انصاری خاتون کسی کام کی غرض سے بنو قینقاع کے بازار میں گئی۔ وہاں ایک یہودی سنار نے خبث باطن کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کی بے حرمتی کی۔ اتفاق سے وہاں ایک انصاری مسلمان موجود تھے، انہوں نے اس زیادتی پر احتجاج کیا تو تمام یہودیوں نے مل کر ان پر حملہ کر دیا اور نتیجتاً وہ شہید ہو گئے۔ ایک یہودی بھی ان کے ہاتھوں اس ہنگامے کی نذر ہو گیا۔ یہودیوں نے فتنے کو ہوا دی۔ بازار میں موجود باقی مسلمانوں پر بھی حملہ کر دیا۔ آنحضرت ﷺ کو واقع کی اطلاع ملی تو آپ صحابہ کی ایک جمعیت لے کر وہاں آ پہنچے۔ یہودیوں نے مقابلہ کیا لیکن ان کی مسلم جمعیت کے سامنے پیش نہ آئی اور وہ معمولی جھڑپ کے بعد قلعے میں محصور ہو گئے۔ پندرہ دن تک ان کا محاصرہ جاری رہا۔ بالآخر انہوں نے ہتھیار ڈال دیے۔ عرب کے دستور کے مطابق ان کے تمام مردوں کو قتل کر دینا چاہیے تھا لیکن عبداللہ بن ابیؔ کی سفارش پر وہ اس سے بچ گئے اور "آنحضرت ﷺ نے انہیں حکم دیا کہ وہ اپنے مال و متاع سمیت مدینے سے نکل جائیں"۔[۹۲]

بنو نضیر کا اخراج

ایک مرتبہ آنحضرت ﷺ بنو نضیر کے ہاں تشریف لے گئے تو سرداران بنو نضیر نے خلاف توقع آپ کا پرتپاک استقبال کیا۔ اندرونِ خانہ انہوں نے یہ سازش تیار کر رکھی تھی کہ حضور ﷺ کو دیوار کے اوپر سے ایک پتھر گرا کر شہید کر دیا جائے لیکن آنحضرت ﷺ کو بذریعہ وحی اس ناپاک سازش کا علم ہو گیا اور آپ وہاں سے چل پڑے اور یوں ان سازشیوں کی ناپاک سازش خاک میں مل گئی۔ ضروری تھا کہ اس سازشی عنصر کو ان کے کیے کی سزا دی جائے۔ چنانچہ آپ نے نوٹس دیا کہ وہ دس روز کے اندر اندر مدینہ

---

92 طبقات ابن سعد۔ جلد ۳، صفحہ ۱۹۹

طیبہ سے نکل جائیں۔ عبد اللہ بن ابیؔ وغیرہ نے انہیں امداد کا یقین دلا رکھا تھا۔ اس لیے آنحضرت ﷺ کے جواب میں سخت رویہ اختیار کیا۔ حتیٰ کہ آپ ﷺ کو بنو قریظہ کی طرح بنو نضیر کا بھی محاصرہ کرنا پڑا۔ آخر کار انہوں نے بھی ہتھیار ڈال دیے اور انہیں بھی یہ حکم ملا کہ مدینہ سے نکل جائیں۔ یہ لوگ اونٹوں پر جو کچھ لاد سکتے تھے لاد کر مدینہ سے کوچ کر گئے اور خیبر، وادی القریٰ، شام وغیرہ میں جا کر سکونت اختیار پزیر ہوئے۔

غزوۂ احزاب

غزوہ احد سے پہلے اور بعد میں بہت سے ایسے واقعات پیش آئے جن میں قریش اور ان کے حلیفوں کو بہت ہزیمت اٹھانی پڑی۔ چنانچہ ان تمام قبائل اور قریش نے مل کر ایک مرتبہ پوری قوت کے ساتھ مدینہ طیبہ پر حملہ کرنے کا پروگرام بنایا۔ اِکا دُکا اور الگ الگ ہو کر سب طبع آزمائی کر چکے تھے اور انہیں یقین ہو چکا تھا کہ الگ الگ وہ مسلمانوں سے ٹکر لینے کی ہمت اور صلاحیت نہیں رکھتے۔ چنانچہ ان کے خیال میں مختلف قبائل کا مشترکہ حملہ ہی رسول اور اصحاب رسول ﷺ کو شکست دے سکتا تھا۔

اس منصوبے کے تحت ۵ھ کو قبائل عرب کی ایک بھاری جمعیت مدینہ طیبہ پر حملہ آور ہونے کی نیت سے روانہ ہوئی، اس سے پہلے عرب میں غالباً اتنا لشکر کبھی جمع نہیں ہوا تھا۔ پروگرام یہ طے پایا کہ شمال کی طرف سے بنو نضیر اور بنو قینقاع حملہ آور ہوں گے۔ مشرق کی طرف سے غطفان کے قبائل اور جنوب کی طرف سے قریش اپنے جُملہ حلیفوں کے ساتھ مل کر چڑھائی کریں گے۔ مجموعی طور پر اس فوج کی تعداد تقریباً دس بارہ ہزار تھی۔

آنحضرت ﷺ نے دفاع کے لیے صحابہ کرامؓ سے مشورہ طلب کیا۔ مشہور ہے کہ صحابہ کرام میں سے حضرت سلمان فارسیؓ نے آپ کو مشورہ دیا کہ شہر کے اطراف میں خندق کھودی جائے لیکن تاریخ کی کتابوں میں خندق کھودنے کے متعلق ایک

اور بات بھی ملتی ہے جس کا ذکر ابن ہشام نے کیا ہے یعنی جب ابو سفیان نے طعنہ زنی کی اور کہا کہ یہ نیا داؤ کس سے سیکھا ہے تو جواب میں آنحضرت ﷺ نے فرمایا: "کہ خدا نے ہمیں یہ چیز الہام کی"۔

الغرض آپ نے مدینہ منورہ کے گرد خندق کھدوائی اور خود شہر میں قلعہ بند ہو گئے۔ سرور عالم ﷺ صحابہ کرامؓ کے ساتھ خندق کی کھدائی میں برابر کے شریک رہے۔ ایک عجیب اور پر کیف منظر تھا۔ سردی کا موسم تھا۔ سرد ہوائیں چل رہی تھیں۔ صحابہ کرام بھوک سے نڈھال تھے، مگر وارفتگی کا یہ عالم تھا کہ خندق کھودتے اور مٹی اٹھاتے وقت اشعار کی زبان میں عقیدت و محبت کے پھول نچھاور کر رہے تھے۔ اور باآواز بلند یہ کہہ رہے تھے:

نَحْنُ الَّذِیْنَ بَایِعُوْ مُحَمَّدَاً

عَلَی الْجِهَادِ مَا بَقِیْنَا اَبَدَاً

ہم ہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے محمد ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کی ہے اور ہم اپنی جان کو (ان کے ہاتھوں) فروخت کر چکے ہیں۔ جب تک جان میں جان ہے، کافروں سے جہاد کرتے رہیں گے۔

سرور عالم ﷺ اپنے جان نثاروں کی وارفتگی کے منظر کو بڑے محبت بھرے انداز سے دیکھ رہے تھے اور جواباً زبانِ نبوت سے ان خوش نصیبوں کے لیے یہ کلمات مبارکہ نکل رہے تھے:

اَللّٰهُمَّ لَا عَیْشَ اِلَّا عَیْشَ الْاٰخِرَة

فَاغْفِرِ الْاَنْصَارَ وَالْمُهَاجِرَه

اے اللہ زندگی تو بے شک آخرت کی زندگی ہے، پس انصار و مہاجرین کی مغفرت فرما۔

اس خندق کی کھدائی کے دوران ایک سخت چٹان آگئی، سرور عالم ﷺ نے اپنے

مبارک ہاتھوں سے اس چٹان کو توڑا۔

یوں تو ہر شخص مساوات کا دعویدار ہو سکتا ہے اور دعویٰ کرنے کے لیے کوئی رکاوٹ بھی پیش نہیں آتی لیکن اصل مسئلہ تو اس دعویٰ پر پورا اترنے کا ہوتا ہے۔ سرور عالم ﷺ کی ذات مبارکہ ہی ایسی ہے جس نے ہر دعوے کو عملی جامہ پہنا کر قول و فعل کو ہم آہنگ کر دیا۔ اسی خندق کی جنگ کے دوران صحابہ نے بھوک کی شکایت کی اور اپنے پیٹ پر بندھے ہوئے پتھر دکھائے لیکن جواباً جب باعثِ تخلیق کائنات ﷺ نے اپنے پیٹ پر بھی بندھے ہوئے پتھر دکھائے تو حیرانگی کی انتہا نہ رہی۔ جس پیغمبر کی سیرت میں قول و فعل کی ہم آہنگی کی یہ کیفیت ہو اس کے پیروکار اس پر کیوں نہ والہ و شیدا ہوں۔

حملہ آور جب حملے کے لیے آ پہنچے تو انہیں اس نئے طریقۂ جنگ سے واسطہ پڑا، مجبوراً انہوں نے محاصرہ کیا۔ محاصرہ بہت شدید تھا، صحابہ نے بہت تکالیف برداشت کیں اور انہیں کئی کئی روز فاقوں سے گذارنے پڑے۔

چھ روز کفار خندق کی دوسری طرف سے تیر برساتے رہے لیکن کوئی بات نہ بنی، ایک روز چند آدمیوں نے خندق عبور کرنا چاہی اور دوسری طرف آ پہنچے لیکن فوراً ان کا کام تمام کر دیا گیا۔

اب کفار نے سیاست سے کام لیا اور بنو قریظہ جو کہ مدینہ کے اندر آباد تھے اور درونِ خانہ کفار سے ساز باز کیے ہوئے تھے، کو مجبور کیا کہ وہ پشت سے مسلمانوں پر حملہ آور ہوں۔ آنحضرت ﷺ کو اس سازش کا علم ہوا تو فوراً انصار کے چند سرداروں کو حقائق معلوم کرنے کے لیے بھیجا۔ پتہ چلا کہ بنو قریظہ فی الواقع خباثت پر تلے بیٹھے ہیں۔ اس صورتحال سے نبٹنے کے لیے ایک نو مسلم صحابی نعیمؓ بن مسعود نے بہت اہم کردار ادا کیا۔ نعیمؓ سرور عالم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ ابھی تک میرا اسلام لانا مشہور نہیں ہوا، اس لیے اگر اجازت مرحمت فرمائیں تو کسی تدبیر سے دشمنوں میں پھوٹ ڈالنے کی

کوشش کروں۔اجازت ملنے پر نعیم بنو قریظہ کے پاس گئے اور ان سے کہا کہ قریش اور بنوغطفان باہر سے آئے ہیں۔وہ محاصرے سے تنگ آکر واپس جاسکتے ہیں۔اس کے بعد تمہارا جینا مشکل ہو جائے گا۔ اس لیے تم اس وقت تک جنگ میں حصہ نہ لو جب تک وہ اپنے چند سرداروں کو تمہارے پاس بطور یرغمال نہ رکھ دیں۔یہ بات بنو قریظہ کے دل کو بہت پسند آئی اور مشورے پر عمل کرنے کا فیصلہ کرلیا۔یہاں سے فارغ ہو کر نعیم قریش اور بنوغطفان کے پاس پہنچے اور ان سے کہا کہ بنو قریظہ کچھ ڈھیلے پڑتے جارہے ہیں۔ ممکن ہے وہ تم سے کچھ سرداروں کو بطور یرغمال طلب کریں اور پھر انہیں محمد (ﷺ) کے حوالے کر کے اپنا معاملہ صاف کرلیں۔کفار اور بنوغطفان بنو قریظہ کی طرف سے ہوشیار ہوگئے اور بنو قریظہ کے سرداروں کے پاس پیغام بھیجا کہ ہم محاصرے سے تنگ آگئے ہیں۔لہٰذا کل تم ادھر سے حملہ کرو اور ہم ادھر سے حملہ آور ہوں گے۔جواب میں بنو قریظہ نے حسبِ فیصلہ یرغمال کا مطالبہ کیا جس سے کفار کو یقین ہوگیا کہ نعیم نے جو اطلاعات دی تھیں وہ مبنی بر حقیقت تھیں اور یوں یہ لوگ باہم منافرت کا شکار ہوگئے، پھوٹ پڑنے کی صورت میں ان کے حوصلے بہت پست ہوگئے اور یوں بھی محاصرہ کیے پچیس روز سے زیادہ ہوگئے تھے اور پھر ساتھ ہی نصرتِ ایزدی نے مسلمانوں کا یوں ساتھ دیا کہ ایک رات زور دار آندھی کے ساتھ بجلی کڑکی جس سے کفار کے اوسان خطا ہوگئے، ان کے خیمے الٹ پلٹ گئے اور راتوں رات میدان سے بھاگ نکلے۔ دوسرے دن صبح مسلمانوں نے دیکھا تو میدان بالکل صاف تھا۔ یہ حملہ کئی قبائل کا مشترک حملہ تھا اور اس میں اس واضح ناکامی نے قریش کے حوصلے ہمیشہ کے لیے پست کردیے۔

متفرق واقعات

جنگ احزاب کے بعد بے شمار واقعات رونما ہوئے۔اس دوران آنحضرت ﷺ

نے حضرت زینبؓ سے نکاح کیا۔ حضرت زینبؓ آپ کی پھوپھی زاد بہن تھیں اور ان کی شادی آپ کے متبنیٰ زید بن حارثہ سے ہوئی تھی۔ اختلافات طبع کے باعث وہ زیادہ عرصہ تک رشتۂ ازدواج میں منسلک نہ رہ سکے چنانچہ حضرت زید نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی۔ عرب کے دستور کے مطابق متبنیٰ کو بھی حقیقی بیٹے کے حقوق حاصل تھے۔ سرورِ عالم ﷺ نے اس رسم کو مٹانے کی خاطر اپنی پھوپھی زاد بہن حضرت زینبؓ سے خود شادی کرلی۔

پردے کا حکم

اسلام نے حقوقِ نسواں کو پورا پورا تحفظ دیا، لیکن اس کے ساتھ ساتھ اسے اس کی فطرت کے مطابق وہی ذمہ داری سونپی جس کو سر انجام دینے پر وہ پوری طرح قادر تھی۔ انہیں چار دیواری کی زینت قرار دیا گیا اور حکم نازل ہوا کہ "شریف عورتیں گھر سے نکلیں تو چادر اوڑھ کر، سینے پر آنچل ڈال کر، چلنے میں اٹھکیلیاں نہ کریں، پردے کی اوٹ سے بولیں، آواز میں لوچ پیدا نہ کریں، ازواجِ مطہرات نامحرموں کے سامنے نہ آئیں"۔[93]

آج آزادیٔ نسواں کے نام پر بناؤ سنگھار کے ساتھ جس بے حیائی کا مظاہرہ ہوتا ہے، اسلام اس کی ہرگز اجازت نہیں دیتا۔ داعیٔ اسلام ﷺ نے خواتینِ اسلام کو خداوند عالم کا یہ واضح حکم سنایا:

وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُولَىٰ[94]

اسلام سے پہلے جاہلیت کے زمانہ میں جس بناؤ سنگھار کی تم نمائش کرتی پھرتی تھیں، وہ اب نہ کرو۔

الغرض ۵ھ میں مسلم خواتین کو پردے کا حکم دیا گیا۔ ان کی ذمہ داریوں کو گھر

93 تفسیر ابن کثیر، جلد ۳، صفحہ ۵۱۸

94 الاحزاب: ۳۳

کی حدود کے اندر رکھا گیا۔

سرورعالم ﷺ کا ارشاد ہے:

اَلْمَرْأَةُ رَاعِيَةٌ عَلٰى بَيْتِ زَوْجِهَا وَهِيَ مَسْئُوْلَةٌ

عورت اپنے شوہر کے گھر کی حکمران ہے اور وہ اپنی حکومت کے دائرہ میں اپنے عمل کے لیے جواب دہ ہے۔

یہی وجہ تھی جس کی بناء پر اس کو ایسے تمام فرائض سے سبکدوش کر دیا گیا جو بیرون خانہ کے امور سے تعلق رکھتے ہیں۔ مثلاً نماز جمعہ خواتین پر واجب نہیں، جنازوں میں شرکت کی اجازت نہیں۔ نماز باجماعت مسجد میں ضروری نہیں۔ محرم کے بغیر سفر کی اجازت نہیں۔

صلح حدیبیہ

چھ سال گزر چکے تھے۔ مسلمان مدینہ طیبہ میں مقیم تھے۔ بتقاضائے انسانی انہیں اپنا آبائی وطن بہت یاد آتا تھا۔ اس شہر کے در و دیوار ان کی آنکھوں کے سامنے آتے تو بہت جذباتی کیفیت ہو جاتی اور کیوں نہ ہو، یہ شہر ان کے آباء واجداد کا شہر تھا، ان کی ولادت کا شہر تھا۔ اس شہر کی گلیوں میں کھیل کود کر ان حضرات نے جوانی کی منزل میں قدم رکھے تھے لیکن قربان جایئے اس فلسفۂ حیات پر جس نے تمام حسی بنیادوں کو مٹا کر صرف ایک عقیدہ کو محورِ حیات قرار دے دیا، لوگوں نے اپنے آباء واجداد، مال و اولاد، زمین وجائیداد اور وطن کو قربان کر دیا۔ سرورعالم ﷺ ان تمام کیفیات سے بخوبی آگاہ تھے۔ چنانچہ ٦ھ کو آپ نے عمرہ کرنے کا ارادہ فرمایا۔ تقریباً ۱۵۰۰ ر صحابہ کرامؓ آپ کے ہمراہ تھے۔ یہ مہینے عربوں کے نزدیک بھی محترم تھے اور ان میں جنگوں کا سلسلہ بند ہو جاتا تھا لیکن اس خیال کے پیش نظر کہ مبادا مشرکین مکہ نہ سمجھیں کہ آنحضرت بغرض جنگ تشریف لا رہے ہیں، ارشاد فرمایا:

ماسوائے تلوار کے کوئی سامانِ حرب ساتھ نہ رکھا جائے، اور تلوار بھی میان میں رکھی جائے۔ مکہ کے قریب پہنچ کر ایک آدمی کو دریافتِ احوال کے لیے بھیجا۔ اس نے واپس آکر اطلاع دی کہ قریش جنگی تیاریوں میں مصروف ہیں، وہ اس بات پر پوری طرح آمادہ ہیں کہ مسلمانوں کو کسی صورت مکہ مین داخل نہ ہونے دیں گے۔

علاوہ ازیں ایک لشکرِ کفار خالد بن ولید کی قیادت میں مسلمانوں کا راستہ روکنے کے لیے روانہ کیا جا چکا ہے۔ حالات سے مطلع ہونے کے بعد آنحضرت ﷺ نے راستہ تبدیل کر لیا اور حدیبیہ کے مقام پر جا کر پڑاؤ ڈال لیا۔ حدیبیہ ایک کنویں کا نام ہے جس کے متصل ایک گاؤں آباد ہے۔ وہ بھی "حدیبیہ" کے نام سے ہی مشہور ہے۔ یہ گاؤں مکہ مکرمہ سے تقریباً ۹ر میل کے فاصلے پر واقع ہے۔

حدیبیہ میں ٹھہرنے کے بعد آپ نے ایک صحابی خراش بن امیہ خزاعیؓ کو مکہ بھیجا تا کہ وہ مکہ والوں کو اس بات سے آگاہ کریں کہ مسلمان صرف اور صرف عمرہ کی ادائیگی کے لیے آئے ہیں، جنگ وغیرہ کا ارادہ نہیں رکھتے۔ مکہ والوں نے اس پیغام رساں کے اونٹ کو ذبح کر دیا، ان کو مارنے پر بھی تُل گئے لیکن وہاں موجود ان کے اعزّہ نے انہیں بچا لیا اور وہ بمشکل جان بچا کر واپس پہنچے۔ اس کے بعد آنحضرت ﷺ نے حضرت فاروق اعظمؓ کو سفارت کی ذمہ داری سونپنی چاہی لیکن حضرت عمرؓ نے یہ گزارش کی کہ میرا وہاں (مکہ میں) کوئی رشتہ دار نہیں اور مکہ والے مجھ سے بہت زیادہ عداوت رکھتے ہیں، لہٰذا بہتر ہو گا کہ حضرت عثمانؓ کو بھیجا جائے۔ ان کے مکہ میں بہت قرابت دار رہتے ہیں۔ حضور ﷺ نے اس رائے کو پسند فرمایا اور حضرت عثمانؓ کو یہ فریضہ سونپا گیا۔ قریش نے حضرت عثمانؓ کو نظر بند کر دیا لیکن مسلمانوں میں یہ افواہ پھیل گئی کہ حضرت عثمان شہید کر دیے گئے۔ اس خبر نے مسلمانوں میں ایک ہلچل مچا دی، آنحضرت ﷺ نے اس موقع پر سب سے مر مٹنے کی بیعت لی جو آج تک تاریخ و سیرت میں بیعتُ الرضوان کے نام سے مشہور ہے۔ آپ نے

سب صحابہ کرام سے عہد لیا کہ وہ حضرت عثمان کا بدلہ لیں گے اور جب تک جان میں جان ہے، شکست تسلیم نہیں کریں گے۔

اس موقع پر حضرت عثمانؓ کو یہ اعزاز حاصل ہوا کہ نبی مکرم ﷺ نے اپنے ایک ہاتھ پر دوسرا ہاتھ رکھ کر حضرت عثمانؓ کی طرف سے بیعت کی۔ اسی بیعت کا ذکر قرآن مجید میں مذکور ہے۔ ارشاد خداوندی ہے:

لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ فَاَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ عَلَيْهِمْ وَاَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيْبًا[95]

خدا مسلمانوں سے راضی تھا جب کہ وہ تیرے ہاتھ پر درخت کے نیچے بیعت کر رہے تھے، سو خدا نے جان لیا جو کچھ ان کے دلوں میں تھا، تو خدا نے ان پر تسلی نازل فرمائی اور عاجلانہ فتح دی۔

ہر چند کہ بیعت کے بعد یہ معلوم ہو گیا کہ حضرت عثمانؓ کی شہادت کی خبر غلط تھی لیکن اس بیعت کے ذریعے مسلمانوں کے مر مٹنے کے عزم نے کفّار کے حوصلے پست کر دیے اور وہ صلح کی گفتگو کے لیے آمادہ ہو گئے۔ سب سے پہلے قریش کی طرف سے عُروہ بن مسعود آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تا کہ آپ سے گفتگو کریں، اور باتوں کے علاوہ صحابہ کی محبتِ رسول اور اطاعتِ رسول کے والہانہ جذبات نے عُروہ کو بہت زیادہ متاثر کیا۔ اس نے دیکھا کہ ہر شخص اپنے آقا کے اشارۂ ابرو کا منتظر ہے اور ہر شخص کی خواہش ہے کہ آنحضرت ﷺ کے حکم کی تعمیل کی سعادت اسے حاصل ہو، چنانچہ واپس آکر عُروہ نے قریش سے کہا" اے قوم! واللہ میں نے قیصر و کسریٰ، نجاشی اور بڑے بڑے بادشاہوں کے دربار دیکھے ہیں مگر خدا کی قسم عقیدت و محبت، تعظیم و اجلال کا یہ عجیب و غریب منظر کہیں

---

95 الفتح:۱۸

نہیں تھا"۔[96]

بعد ازاں قریش نے سہیل بن عمرو کو صلح کی شرائط طے کرنے کے لیے بھیجا اور درج ذیل شرائط طے ہوئیں۔

۱۔ مسلمان اس سال بغیر عمرہ کیے واپس چلے جائیں۔

۲۔ اگلے سال آئیں اور صرف تین دن قیام کریں۔

۳۔ ہتھیار لگا کر نہ آئیں، صرف تلوار ساتھ لائیں اور وہ بھی نیام میں۔

۴۔ مکہ میں جو مسلمان پہلے سے مقیم ہیں، انہیں ساتھ نہ لے جائیں اور اگر کوئی مدنی مسلمان مکہ میں ٹھہرنا چاہے تو اسے نہ روکیں۔

۵۔ اہل مکہ میں سے کوئی شخص مدینہ چلا جائے تو واپس کر دیا جائے لیکن اگر کوئی مسلمان مکہ میں آجائے تو واپس نہیں کیا جائے گا۔

۶۔ قبائل عرب کو اختیار ہو گا کہ فریقین میں سے جس کا چاہیں ساتھ دیں۔

۷۔ دس سال تک مسلمان اور قریش آپس میں جنگ نہیں کریں گے۔

مذکورہ بالا شرائط بظاہر مسلمانوں کے حق میں نہیں تھیں، اور یہ بات مسلمانوں کو انتہائی ناگوار بھی گزری۔ معاہدے کی شرائط ابھی لکھی جارہی تھیں کہ سہیل کا اپنا بیٹا ابو جندل جو مشرف باسلام ہو چکا تھا، کفّار کی اذیتوں سے بھاگ کر آپ کی خدمت میں آپہنچا لیکن معاہدے کی رو سے آپ ﷺ نے اسے واپس کر دیا۔ ابو جندلؓ کی حالتِ زار دیکھ کر صحابہ کرام کے دلوں میں اور زیادہ جوش و ولولہ پیدا ہوا لیکن آنحضرت ﷺ نے انہیں معاہدہ کی پابندی کا حکم دیا۔ ہر چند کہ مسلمان اسے اپنے لیے ایک شکست تصور کرتے تھے لیکن فی الواقع صلح حدیبیہ اشاعتِ اسلام کے لیے دروازہ کھل جانے کے مترادف تھی

---

96 سیرۃ المصطفیٰ، جلد ۲، صفحہ ۳۴۴

اور اسی وجہ سے خداوند عزوجل نے اسے فتح مبین قرار دیا:

إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِينًا[97]

ہم نے تجھ کو کھلی ہوئی فتح عطا کی۔

وقت گزرنے پر یہ بات کھل کر سامنے آگئی کہ بے شک یہ فتح عظیم تھی۔ اس سے پہلے مسلمانوں اور کافروں کا باہم میل جول اور آنا جانا نہیں تھا۔ صلح حدیبیہ کے بعد جب ایک دوسرے کے ساتھ آزادی سے ملنے کے مواقع میسر آئے اور کفار نے اخلاق کریمانہ کے ان مجسموں کو اپنی نظروں سے دیکھا تو ان کے دل خود بخود اسلام کی طرف مائل ہونے لگے اور اسلام تیزی سے پھیلنے لگا۔

دوسری طرف کفار کی طرف سے عائد کردہ شرائط خود کفار کے لیے ایک مصیبت بن گئیں۔ جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے کہ کفار نے یہ شرط عائد کی تھی کہ اگر کوئی مسلمان مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ چلا جائے تو اسے واپس کر دیا جائے گا لیکن اگر کوئی شخص مرتد ہو کر مکہ چلا جائے تو اسے واپس نہیں کیا جائے گا۔ لیکن کفار کو یہ کہاں معلوم تھا کہ اسلام جسموں پر حکومت نہیں کرتا بلکہ وہ انقلابِ روح کا دوسرا نام ہے۔ اور جب کوئی شخص ایک مرتبہ دل کی گہرائیوں سے حقانیت اسلام کا قائل ہو جائے تو پھر اس کے مرتد ہونے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور بالفرض اگر کوئی بدقسمت اس کا مرتکب ہو جائے اور مدینہ سے بھاگ کر مکہ چلا جائے تو مسلمانوں کو اس سے کوئی واسطہ نہیں، ایسے بدباطن کو واپس لانے کی کوئی خواہش ہی نہیں ہو سکتی۔

اصل تکلیف دہ معاملہ صرف ان مسلمانوں کا تھا جو تاحال مکہ ہی میں مقیم تھے اور انتہائی ظالمانہ سزاؤں کا ہدف بنے ہوئے تھے۔ ایک مرتبہ ایک ابو بصیر نامی صحابی بھاگ کر

---

97 الفتح:۱

بار گاہِ رسالت مآب ﷺ میں پہنچ گئے، حسبِ معاہدہ قریش نے دو آدمی بھیجے اور ان کی واپسی کا مطالبہ کیا۔ آنحضرت ﷺ نے انہیں ان کے حوالے کر دیا۔ راستے میں ابو بصیر ان پر حملہ آور ہوئے، ایک کو قتل کر دیا اور دوسرا جان بچا کر واپس مدینہ جا پہنچا۔ ابو بصیر بھی آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ حضور ﷺ نے ایفائے عہد کرتے ہوئے مجھے واپس فرما دیا تھا، اب آپ اپنے فرض سے سبکدوش ہو گئے ہیں۔ یہ کہہ کر وہ وہاں سے چل دیے اور ساحلِ سمندر پر اس جگہ سکونت اختیار کر لی جہاں سے قریش کے شام کو جانے والے تجارتی قافلے گذرا کرتے تھے، ابو جندل کو معلوم ہوا تو وہ بھی وہاں آپہنچے اور اس طرح دیگر ستم رسیدہ مسلمان بھی وہاں پہنچ گئے۔ ان لوگوں نے اپنی گذر بسر کے لیے قریشی قافلوں پر چھاپے مارنے شروع کر دیے۔ اس صورت حال نے قریش کو بہت پریشان کر دیا اور انہوں نے تحریری طور پر اپنی شرط واپس لے لی۔ اور لکھ بھیجا کہ جو مسلمان مدینہ جانا چاہے جا سکتا ہے۔

سلاطین کو دعوتِ اسلام

صلح حدیبیہ کے بعد آنحضرت ﷺ کو اطمینان نصیب ہوا تب آپ نے اشاعتِ اسلام کے کام پر خصوصی توجہ دی اور آپ نے سرزمین عرب سے نکل کر دوسری سلطنتوں تک حق کی آواز کو پہنچانا چاہا۔ چنانچہ بہت سے سلاطین کے نام دعوتِ اسلام کے مکتوبات گرامی ارسال کیے۔ ان سلاطینِ مملکت اور رؤساء میں درج ذیل قابل ذکر ہیں:

قیصر روم، کسریٰ ایران، عزیزِ مصر، نجاشی شاہِ حبش، رؤسائے یمامہ، والیٔ شام اور والیٔ بصرہ۔

قیصر روم کو مکتوبِ گرامی ملا تو اس کے حکم سے اس کے شہر میں موجود ابو سفیان کو اس کی خدمت میں حاضر کیا گیا۔ اس نے ابو سفیان سے آنحضرت ﷺ کے متعلق

سوالات کیے اور جواب سن کا انتہائی متاثر ہوا، مگر تاج و تخت کے لالچ میں دولت ایمانی سے محروم رہا۔

کسریٰ نے آنحضور ﷺ کے مکتوبِ گرامی کی توہین کی اور اسے ٹکڑے کر دیا۔ مقتوش، عزیزِ مصر بھی ایمان سے محروم رہا لیکن آپ کے قاصد کا انتہائی احترام کیا اور آپ کے لیے دو قبطی لڑکیاں (ماریہ اور سیرین) لباس اور خچر تحفتاً بھیجا۔ شاہِ حبش نجاشی پہلے ہی سے اسلام سے متاثر تھا، مکتوبِ گرامی ملا تو اسے آنکھوں سے لگایا اور حضرت جعفر طیارؓ کے ہاتھوں حقانیتِ اسلام پر ایمان لے آیا۔ شرحبیل والیٔ بصرہ نے آپ کے قاصد حارث بن عمیر کو شہید کر دیا۔

دو نامور جرنیلوں کا قبول اسلام

۶/ھ کو دو نامور جرنیلوں حضرت خالد بن ولید اور عمر بن العاص نے اسلام قبول کیا اور پھر اشاعتِ اسلام کے لیے وہ کارہائے نمایاں سر انجام دیے جن کی چمک تاریخ اسلام کے اوراق میں آج بھی ماند نہیں پڑی۔ انہی دونوں جرنیلوں نے عراق و شام اور مصر کو فتح کر کے حدود اسلام میں داخل کیا۔

غزوۂ خیبر

یہودیوں کا خیبر میں بہت بڑا مرکز تھا۔ یہ ہمیشہ سازشوں میں مصروف رہتے تھے۔ ان کے ساتھ ہی قبیلہ غطفان آباد تھا، یہ قبیلہ یہود کا حلیف تھا، یہ لوگ حملہ کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ آنحضور ﷺ باخبر تھے۔ چنانچہ ۶/ھ کو آپ نے خیبر پر چڑھائی کا ارادہ کیا، راستے میں بنو غطفان نکلے لیکن ہمت نہ ہوئی اور واپس ہو گئے، خیبر میں تقریباً بیس ہزار فوجی یہودی اپنے قلعوں میں موجود تھے۔ حضور ﷺ نے پہلے چھوٹے چھوٹے قلعے فتح کیے، لیکن قموص بہت اہم قلعہ تھا، بہت بڑا پہلوان مرحب اسی قلعہ میں تھا۔ تین دن تک یہ قلعہ

فتح نہ ہوا۔ تیسرے روز مرحب رجز پڑھتا ہوا میدان میں نکلا تو حضرت علیؓ نے اس کا کام تمام کر دیا، جس سے یہودیوں کے حوصلے پست ہو گئے۔ بیس روز کے محاصرے کے بعد یہ قلعہ فتح ہوا، ترانوے یہودی واصل جہنم ہوئے اور بیس صحابہ نے شہادت کا مرتبہ پایا، فتح خیبر میں رئیسِ خیبر کی لڑکی قید ہو کر آئی تھیں۔ آنحضرت ﷺ نے انہیں آزاد کر کے ام المؤمنین کا اعزاز بخشا۔

وادی القراء

خیبر کی فتح کے بعد آنحضرت ﷺ وادئ القریٰ کی جانب روانہ ہوئے۔ یہودیوں نے اس وقت مسلمانوں پر حملہ کیا لیکن زیادہ دیر نہ ٹھہر سکے اور خیبر کی شرائط پر صلح کر لی۔

عمـــرہ

معاہدہ کے مطابق دوسرے سال آنحضرت ﷺ عمرہ کے لیے تشریف لے گئے، حسبِ معاہدہ اسلحہ کے بغیر مکہ میں داخل ہوئے۔ صحابہ کرامؓ کی ایک بڑی جماعت آپ کے ہمراہ تھی۔ اس وقت صحابہ کرام کے قلوب کی عجیب کیفیت ہوئی ہو گی، اپنے وطن کی گلیوں اور در و دیوار کو دیکھ کر مسرت کے آنسو اُمڈ پڑے ہوں گے۔

کفار کا خیال تھا کہ موسمی و علاقائی تغیر و تبدل کی وجہ سے مسلمان کافی کمزور ہو گئے ہوں گے۔ اس خیال کو رد کرنے کے لیے آنحضرت ﷺ نے صحابہ کرام کو ارشاد فرمایا کہ طواف کعبہ کے پہلے تین چکروں میں اکڑتے ہوئے چلو، عربی میں اسے "رمل" کہتے ہیں، سرورِ عالم ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام کی یہ ادا آج تک جاری و ساری ہے، ہر حاجی اس سنت پر عمل کرتا ہے۔

غزوہ موتہ

تبلیغی خطوط کے سلسلے میں آنحضرت ﷺ نے شرحبیل بن عمرو والی بصرہ کو بھی خط لکھا تھا، مگر اس بدبخت نے آنحضرت ﷺ کے قاصد کو قتل کر دیا، اس کا یہ عمل آنحضرت ﷺ کو بہت شاق گذرا، یہود کی جانب سے اطمینان حاصل ہونے کے بعد آپ ﷺ نے اس طرف توجہ کی، تین ہزار کی فوج کو زیدؓ بن حارث کی قیادت میں روانہ فرمایا اور حکم دیا کہ اگر زید شہید ہوں تو جعفر امیر ہو، وہ شہید ہوں تو عبد اللہ بن رواحہ فوج کی قیادت سنبھال لیں۔

شرحبیل کو مسلمان لشکر کی آمد کی اطلاع ملی تو ایک لاکھ افراد پر مشتمل فوج لے کر مقابلے کے لیے نکل کھڑا ہوا، ہر چند کہ تین ہزار سے ایک لاکھ کا کوئی مقابلہ نہیں، مگر قوت ایمانی کے مجسمے اور عزم و ہمت کے پیکر اللہ پر توکل کرتے ہوئے اس لشکر جرار سے ٹکرا گئے اور زید، حضرت جعفر، حضرت عبد اللہ بن رواحہ نے یکے بعد دیگرے جامِ شہادت نوش فرمایا۔ تینوں کی شہادت کے بعد حضرت خالد بن ولید نے فوج کی قیادت سنبھالی اور اس ہمت کے ساتھ دشمن پر تابڑ توڑ حملے کئے کہ ان کے قدم اکھڑ گئے، حضرت خالد کے ہاتھ سے اس روز نو تلواریں ٹوٹیں۔[۹۸] دشمن کے پیچھے ہٹ جانے کو ہی حضرت خالد بن ولیدؓ نے غنیمت جانا اور بڑی خوش تدبیری سے اپنی فوج کو دشمن کے نرغے سے نکال کر لے آئے۔ غزوۂ موتہ میں حضرت خالد نے شجاعت و بہادری کے جو جوہر دکھائے، انہی کی بنا پر سرورِ عالم ﷺ نے انہیں سیف اللہ کا لقب عطا فرمایا۔[۹۹]

---

98 بخاری، جلد، ۵، صفحہ: ۲۸۲

99 بخاری، جلد، ۵، صفحہ: ۱۸۲

فتح مکہ

معاہدہ حدیبیہ میں عرب کے دیگر قبائل کو اپنی مرضی پر چھوڑ دیا گیا تھا کہ وہ جس کا حلیف بننا چاہیں بن جائیں۔ معاہدہ حدیبیہ کی رو سے ان میں سے کسی کو بھی دوسرے پر ہاتھ اٹھانے کا حق نہ تھا، لیکن قریش اور اس کے حلیف قبیلہ نے معاہدہ کی پاسداری نہ کی۔ بنو بکر نے خزاعہ کے آدمیوں پر حملہ کیا۔ انہوں نے حرم میں پناہ لینا چاہی مگر وہاں بھی خون بہایا گیا، اس حملے میں قریش نے اپنے حلیف قبیلے کی اسلحہ و افراد کے ساتھ مدد کی۔ اس صورتِ حال کی اطلاع دینے کے لیے خزاعہ کا ایک وفد بارگاہ رسالت مآب میں حاضر ہوا اور جملہ حالات بیان کیے۔ آنحضرت کو قریش کی طرف سے یہ بدعہدی بہت ناگوار گزری اور آنحضرت ﷺ نے ایک قاصد کو مکہ روانہ کیا اور حسبِ ذیل تین شرطیں پیش کیں اور قریش کو اختیار دیا کہ ان میں سے جونسی شرط چاہیں قبول کر لیں۔

۱۔ مقتولوں کا خون بہا دیا جائے۔

۲۔ قریش، بنو بکر کی حمایت سے دست بردار ہو جائیں۔

۳۔ معاہدہ حدیبیہ کے ٹوٹ جانے کا اعلان کر دیا جائے۔

آنحضرت ﷺ کے قاصد نے جب یہ تین شرائط مکہ والوں کے سامنے پیش کیں تو ان میں سے قرطہ بن عمر نے جواب میں کہا کہ ہمیں تیسری شرط منظور ہے۔ گویا معاہدہ حدیبیہ فسخ کرنے کا اعلان کر دیا جائے، یہ جواب پا کر آنحضرت ﷺ کا قاصد عازم مدینہ ہو گیا تو قریش کو خیال آیا کہ ہم نے یہ کیا کیا؟ انہیں اپنے جواب پر بہت پچھتاوا ہوا۔ تلافی کے لیے ابو سفیان کو مدینہ روانہ کیا تا کہ تجدید معاہدہ کیا جائے، ابو سفیان مدینہ پہنچا۔ ابو بکر و عمر سے سفارش کرانا چاہی لیکن انہوں نے منظور نہ کیا اور آنحضرت ﷺ نے تجدید معاہدہ سے انکار کر دیا۔ ابو سفیان کے واپس جانے کے بعد آنحضرت ﷺ نے صحابہؓ

کرام کو جنگی تیاریوں کا حکم دیا مگر ساتھ ہی ان تیاریوں کو مخفی رکھنے کے لیے ارشاد فرمایا۔ ایک صحابی رسول حاطب بن ابی بلتعہؓ نے مکہ والوں کو خبر دار کرنے کی کوشش کی اور اس سلسلے میں مکہ جانے والی ایک خاتون کو قریش کے بعض سرداروں کے نام ایک خط دیا۔ خط کا مضمون حسبِ ذیل تھا۔

> اے گروہ قریش! رسول اللہ ﷺ رات کی مانند تم پر ایک ہولناک لشکر لے کر آنے والے ہیں جو سیلاب کی طرح بہتا ہو گا۔ خدا کی قسم اگر رسول اللہ ﷺ بلا لشکر کے خود تنِ تنہا بھی تشریف لے جائیں تو اللہ تعالیٰ ضرور ان کی مدد فرمائے گا اور فتح و نصرت کا جو وعدہ خدا نے حضور ﷺ سے کیا ہے وہ ضرور پورا کرے گا۔[100]

آنحضرت ﷺ کے حکم سے حضرت علیؓ، حضرت زبیرؓ اور حضرت مقدادؓ عورت کے تعاقب میں روانہ ہوئے اور راستے میں جا لیا، اس عورت نے یہ خط اپنے بالوں میں چھپا رکھا تھا۔

آنحضرت ﷺ نے خط کی وصولی کے بعد حاطب ابن ابی بلتعہ کو طلب فرمایا اور پوچھا کہ یہ کیا ماجرا ہے؟ حاطب نے عرض کیا "یا رسول اللہ ﷺ آپ مواخذہ میں عجلت نہ فرمائیں، یا رسول اللہ ﷺ! قریش سے میری کوئی قرابت نہیں، فقط حلیفانہ تعلقات ہیں، میرے اہل و عیال آج کل مکہ میں ہیں جن کا کوئی مددگار نہیں۔ بخلاف مہاجرین کے کہ مکہ میں ان کی قرابتیں ہیں، قرابتوں کی وجہ سے ان کے اہل و عیال محفوظ ہیں، اس لیے میں نے چاہا کہ جب قریش سے میری کوئی قرابت نہیں تو ان کے ساتھ کوئی احسان کروں جس کے صلے میں وہ میرے اہل و عیال کی حفاظت کریں، خدا کی قسم میں نے دین سے مرتد ہو کر اور

---

100 فتح الباری، جلد ۷، صفحہ ۴۰۱

اسلام کے بعد کفر سے راضی ہو کر ہرگز یہ کام نہیں کیا۔ میری غرض فقط وہی تھی جو میں نے عرض کی۔[101]

آنحضرت ﷺ نے حقیقت حال بیان کر دینے پر حاطب کو معاف فرما دیا۔
رمضان ۸ھ ہجری کو آنحضرت ﷺ کی قیادت میں دس ہزار جان نثاروں کا لشکر مکہ روانہ ہوا۔ آنحضرت ﷺ نے انتہائی رازدارانہ طور سے یہ سفر کیا تاکہ قریش کو یہ خبر نہ ہو سکے چنانچہ مکہ سے ایک منزل دور مر والظہران پر پہنچ کر آنحضرت ﷺ نے آگ روشن کرنے کا حکم صادر فرمایا۔ ابو سفیان، حکیم بن حزام اور بدیل بن ورقاء صورت حال معلوم کرنے کے لیے آئے۔ ابو سفیان پر حضرت عباس کی نظر پڑ گئی اور وہ اسے حضور ﷺ کی بارگاہ میں لے آئے۔ حضور ﷺ سے اجازت چاہی کہ ابو سفیان کا سر قلم کر دیں مگر حضرت عباسؓ کی سفارش پر آنحضرت ﷺ نے اسلام کے خلاف لڑائیاں لڑنے والے اس قریشی سردار کو معاف کر دیا۔

لشکرِ اسلام جب مکہ کی جانب بڑھا تو آنحضرت ﷺ نے حضرت عباس سے فرمایا کہ وہ ابو سفیان کو لے کر کسی بلند جگہ کھڑے ہو جائیں تاکہ ابو سفیان افواج اسلام کا نظارہ کرے۔ ابو سفیان بلندی پر کھڑا عرب کے مختلف قبائل پر مشتمل اس بحر بیکراں کو مکہ کی طرف بڑھتے دیکھ رہا تھا۔ وہ لوگ اس کے سامنے سے گزر رہے تھے جو اسی مکہ سے بے گھر ہو کر نکلے تھے، جن پر تشدد کی مکہ کے سنگریزے بھی شہادت دے رہے تھے، مکہ کی گرم ریت پر لیٹ کر اَحد اَحد کے نعرے بلند کرنے والے بلال آج لشکر اسلام میں موجود تھے۔ سب سے آخر میں سرور عالم ﷺ کی سواری جاں نثاروں کے جھرمٹ میں نمودار ہوئی۔ دائیں بائیں آگے پیچھے مسلح مہاجرین و انصار انتہائی منظم انداز سے چل رہے تھے، مہاجرین کا علم

---

101 ابن ہشام، جلد ۲، صفحہ ۷۷۶

حضرت زبیر کے ہاتھ میں تھا اور انصار کا علم سعد بن عبادہ کے ہاتھ میں تھا۔ آنحضرت ﷺ نے اعلان فرما دیا کہ جو شخص مسجد حرام میں داخل ہو جائے، اس کو امن ہے اور جو شخص ابو سفیان کے گھر میں داخل ہو جائے، وہ امن میں ہے اور جو شخص اپنے گھر کا دروازہ بند کر لے، وہ بھی امن میں ہے، یہ اعلان سنتے ہی کوئی اپنے گھر کو بھاگا، کسی نے حرم میں پناہ لی اور کوئی ابو سفیان کے گھر پہنچ گیا، صرف چند قریشی نوجوانوں نے حضرت خالد بن ولید کے دستے کی راہ روکنا چاہی مگر تھوڑی ہی دیر میں بھاگ نکلے۔

غور فرمائیے! دس برس کی شبانہ روز جسمانی اور روحانی کاوشوں کے بعد مکے کا جلا وطن آج فاتحانہ انداز میں مکے میں داخل ہو رہا تھا۔ آج دس ہزار سے زائد قدسی صفت جاں نثار اس کے ساتھ تھے، لیکن آنحضرت کا مکہ میں داخلہ کسی جبار فاتح کی طرح نہیں تھا۔ آپ مسبب حقیقی کو بھلا کر نشۂ خود پرستی میں سرشار نہیں تھے۔ آپ کا یہ فاتحانہ داخلہ نبی اور ایک بادشاہ کے داخلے میں فرق کو نمایاں کر رہا تھا۔ آپ عجز و انکسار کے ساتھ حرم میں داخل ہوئے تو تواضع سے گردن اس قدر جھکی ہوئی تھی کہ ریش مبارک کجاوہ کی لکڑی سے مَس کر رہی تھی۔

آنحضرت ﷺ کعبۃ اللہ میں داخل ہوئے اور اللہ کے گھر کو بتوں سے پاک اور صاف کر دیا۔ حضرت فاروق اعظمؓ نے وہاں پر موجود تمام تصویروں کو مٹایا، تطہیر کعبہ کے بعد آپ نے نماز ادا فرمائی اور قریش کے سامنے یہ خطبہ ارشاد فرمایا:

> اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اس کا کوئی شریک نہیں۔ اس نے اپنا وعدہ سچا کیا۔ اپنے بندے کی امداد کی اور سارے گروہوں کو اکیلے ہی شکست دی! خبردار ہر قسم خواہ وہ خون کا مطالبہ ہو یا مال کا وہ میرے ان پاؤں کے نیچے ہے، البتہ بیت اللہ کی دربانی اور حاجیوں کو پانی پلانے کی خدمت کے مناصب جوں کے توں ہیں۔ اے گروہ قریش!

آج کے دن اللہ نے تم سے جاہلیت کا غرور لیا اور آباء و اجداد کے بل پر بڑائی غلط قرار دے دی، سارے انسان آدم کی اولاد سے ہیں اور آدم مٹی سے بنے ہیں۔[102]

اکابر قریش اور دیگر لوگ آنحضرت کے سامنے موجود تھے۔ ان کا اپنا کیا انہیں یاد تھا۔ وہ سوچ رہے تھے کہ ابھی جاں نثاران مصطفیٰ آپ کا اشارہ پاتے ہی ان کے جسم و روح کے رشتے کو منقطع کر دیں گے لیکن رحمۃ للعالمین کی زبانِ نبوت حرکت میں آتی ہے اور یہ الفاظ نکلتے ہیں:

لَاتَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ. اِذْهَبُوْا فَاَنْتُمُ الطُّلَقَآء

آج تم پر کوئی مواخذہ نہیں، جاؤ تم سب آزاد ہو۔

اس عفوِ عام میں سے آٹھ آدمیوں کو مستثنیٰ قرار دیا گیا تھا اور ان کے خون کو مباح کر دیا تھا۔ یہ آٹھ افراد حسب ذیل تھے:

(۱) عبداللہ بن خطل (۲-۳) فرتنیٰ اور قریبہ، دونوں لونڈیاں تھیں (۴) حویرث بن نقید (۵) سارہ (۶) مقیس بن صبابہ (۷) عبداللہ بن سعد بن ابی سرح اور (۸) عکرمہ بن ابی جہل۔

عبداللہ بن خطل قتل کر دیا گیا۔ فرتنیٰ اور قریبہ میں سے ایک ماری گئی اور دوسری کی درخواست پر اسے معاف کر دیا گیا۔ سارہ قتل کر دی گئی۔ حویرث بن نقید قتل کر دیا گیا۔ مقیس بن صبابہ قتل کر دیا گیا۔ عبداللہ بن ابی سرح کو حضرت عثمان کی درخواست پر معاف فرما دیا گیا۔ عکرمہ بن ابی جہل کی درخواست پر اسے بھی معاف کر دیا گیا۔ آنحضرت ﷺ نے عتاب بن اُسید کو مکہ کا والی مقرر فرمایا اور وہ دور صدیقی تک اس عہدے پر متمکن رہے۔

---

102 سیرۃ ابن ہشام، جلد ۴، صفحہ ۸۴

فتح مکہ کے بعد قبائل جوق در جوق حلقۂ اسلام میں داخل ہونا شروع ہو گئے۔ عمرو بن سلمہ مشہور صحابی کا کہنا ہے" عرب قریش کے اسلام کا انتظار کرتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ محمد ﷺ کو ان کی قوم پر چھوڑ دو، اگر محمد ان پر غالب آگئے تو بے شبہ وہ سچے پیغمبر ہیں۔ پس جب مکہ فتح ہوا تو ہر قبیلہ نے اسلام کی طرف پیش دستی کی۔

غزوۂ حنین وطائف

فتح مکہ نے مشرکین کی کمر توڑ دی تھی مگر تاحال دو قبیلے ہوازن اور ثقیف اپنی طاقت پر نازاں تھے، انہیں اپنی جنگی مہارت پر بڑا اعتماد تھا، ان کا کہنا تھا کہ اہل اسلام کو اب تک جن قبائل سے واسطہ پڑا ہے وہ مرد میدان نہ تھے۔ اب جب ہمارے ساتھ مقابلہ ہو گا تو انہیں پتہ چل جائے گا۔ چنانچہ انہوں نے مسلمانوں پر حملہ کرنے کی تیاری مکمل کر لی۔ آنحضرت ﷺ کو جب ان حالات کا علم ہوا تو آپ نے عبداللہ بن حداد کو تحقیق احوال کے لیے بھیجا۔ انہوں نے واپس آکر ان خبروں کی تصدیق کی کہ فی الواقعہ مشرکین تیاری میں مصروف ہیں۔ چنانچہ آپ بارہ ہزار صحابہ کرام کی جمعیت کے ساتھ حنین کی جانب بڑھے۔ اس سے پہلے کبھی مسلمانوں کی اتنی بڑی جمعیت کسی غزوہ میں شریک نہ ہوئی تھی۔ چنانچہ بعض صحابہ کرام کی زبان سے یہ جملہ نکل گیا کہ " آج ہم پر کون غالب آ سکتا ہے"۔ عام حالات میں یہ جملہ کوئی قابلِ گرفت جملہ نہیں، مگر وہ قدسی صفت علمبرداران توحید، جنہوں نے بارگاہ مصطفیٰ ﷺ میں توحید کا درس پڑھا تھا، جنہوں نے معرکۂ بدر میں مٹھی بھر جماعت کو ایک لشکرِ جرار پر غالب آتے دیکھا، ان کی زبان پر کثرت تعداد کا یہ فخریہ جملہ آیا تو بارگاہ الٰہی میں ناگوار گزرا۔ چنانچہ پہلے حملے میں تو مشرکین پسپا ہوئے لیکن پلٹ کر جو حملہ کیا تو مسلم فوج کے پاؤں اکھڑ گئے، مسلم فوج میں مکہ کے مسلم اور غیر مسلم نوجوان بھی شامل تھے، دشمن کو غالب آتے دیکھ کر ان میں سے بعض کی نیتیں بدل گئیں اور منتشر ہو

گئے۔ دیگر مسلم سپاہ کے بھی پاؤں اکھڑ گئے۔

مولانا شبلی لکھتے ہیں:

تیروں کا مینہ برس رہا تھا، بارہ ہزار فوجیں ہوا ہو گئیں تھیں، لیکن ایک پیکر مقدس پا برجا تھا، جو تنہا ایک فوج، ایک مُلک، ایک اقلیم، ایک عالَم، بلکہ مجموعہ کائنات تھا۔ (ﷺ)[103]

سرور عالم ﷺ نے یہ کیفیت دیکھی تو بلند آواز سے پکارا "یا معشر الانصار" (اے انصار کے لوگو) جواب میں آواز آئی، یارسول اللہ (ﷺ) ہم حاضر ہیں، آپ اپنی سواری سے اتر پڑے اور جلال سے ارشاد فرمایا:

اَنَا النَّبِیُّ لَا کَذِبْ　　اَنَا عَبْدُ الْمُطَّلِبْ[104]

میں پیغمبر ہوں، یہ جھوٹ نہیں ہے، میں عبد المطلب کا بیٹا ہوں

حضرت عباسؓ نے بلند آواز سے مہاجرین و انصار کو پکارا۔ ان کی آواز سنتے ہی مسلمان پلٹ پڑے اور پھر بدر و احد کے غازی اس سرفروشی کے ساتھ لڑے کہ کفار کو میدان چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ اور بہت سامالِ غنیمت مسلمانوں کے ہاتھ آیا۔ حنین کے غزوہ کا تذکرہ قرآن مجید میں رب تعالیٰ نے بھی کیا ہے:

وَيَوْمَ حُنَيْنٍ ۙ إِذْ أَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْئًا وَضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْأَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُمْ مُدْبِرِينَ ۞ ثُمَّ أَنْزَلَ اللَّهُ سَكِينَتَهُ عَلَىٰ رَسُولِهِ وَعَلَى الْمُؤْمِنِينَ وَأَنْزَلَ جُنُودًا لَمْ تَرَوْهَا وَعَذَّبَ الَّذِينَ كَفَرُوا ۚ وَذَٰلِكَ جَزَاءُ الْكَافِرِينَ[105]

103 سیرت النبیؐ، جلد ۱، ص ۳۹۱

104 بخاری، جلد ۵، ص ۱۹۴

105 التوبہ ۲۶

اور حنین کے دن جبکہ تمہاری کثرت نے تم کو خود پسندی میں ڈال دیا۔ پس وہ کثرت تمہارے کچھ کام نہ آئی اور زمین باوجود وسیع ہونے کے تم پر تنگ ہو گئی اور پھر تم پشت پھیر کر بھاگے۔ اس کے بعد اللہ نے اپنی خاص تسکین اتاری، اپنے رسول پر اور اہل ایمان کے قلوب پر اور ایسے لشکر اتارے جن کو تم نے نہیں دیکھا، اور کافروں کو سزا دی اور یہی سزا ہے کافروں کی۔

غـــزوہ تبوک

۹ ہجری میں آنحضرت ﷺ کو اطلاع ملی کہ شام میں مسلمانوں سے جنگ کے لیے ایک زبردست فوج تیار کی جا رہی ہے اور ہرقل نے بھی چالیس ہزار کا ایک لشکر جرار بغرض تعاون روم سے روانہ کر دیا ہے۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ انیس ہزار جاں نثاروں کے ساتھ شام کی جانب روانہ ہوئے۔ حضرت علیؓ کو مدینہ چھوڑا گیا۔ تبوک پہنچ کر معلوم ہوا کہ حملے کی خبر غلط تھی، تاہم آپ ﷺ نے بیس روز تک تبوک میں قیام فرمایا۔ آپ کی اس بروقت پیش قدمی اور تبوک میں قیام نے شامیوں کے حوصلے بہت پست کر دیے۔ مقام تبوک میں بہت سے عیسائی سرداروں نے بارگاہ رسالت مآب ﷺ میں حاضر ہو کر اسلام قبول کیا۔

حجۃُ الوداع

حجۃ الوداع کو حجۃ الوداع کہنے کی وجہ یہ ہے کہ سرورِ عالم ﷺ کا یہ آخری حج تھا۔ اس حج کی ادائیگی کے بعد ربیع الاول ۱۱ھ کو آنحضرت ﷺ کی وفات ہو گئی، فرضیتِ حج کے بعد حضور ﷺ کا یہ پہلا اور آخری حج تھا، حجۃ الوداع کی یہ اہمیت بھی کوئی کم نہیں کہ پرستاران رسالت کو آنحضور ﷺ کی سرکردگی میں ادائیگی حج کا موقعہ نصیب ہوا۔

کم وبیش ایک لاکھ صحابہ کرامؓ کو یہ سعادت عظمیٰ نصیب ہوئی، انہوں نے حضور ﷺ کی قیادت میں لبیک اللھم لبیک کے مستانہ وار نعرے لگائے۔ یہ بہت ہی پُر کیف منظر تھا۔ مکہ کے وہ پہاڑ جہاں سے کبھی توحید کے پرستاروں کی چیخ وپکار کی صدائے بازگشت سنائی دیا کرتی تھی، وہاں آج تکبیر وتقدیس کے غلغلے بلند ہو رہے تھے۔ حجۃ الوداع کی خصوصی اہمیت یہ ہے کہ اس پہلے اور آخری حج کے موقع پر آنحضرت ﷺ نے ایک انقلاب وعہد آفرین خطبہ ارشاد فرمایا۔ بلاشبہ یہ خطبہ اس قدر جامع ہے کہ اس میں اسلام کی روح سمودی گئی ہے، اس خطبہ میں اخلاق حسنہ اور تعلیماتِ عالیہ کا کامل پرتو نظر آتا ہے۔ خالق واحد کے بھیجے ہوئے نبی آخر الزمان ﷺ نے اس موقعہ پر اپنی امت کے سامنے واضح اور روشن اصول بیان فرمادیے اور دوٹوک الفاظ میں یہ فیصلہ فرمادیا کہ اگر میری اُمت ان پاکیزہ اصولوں پر کاربند رہی تو دنیا کی کوئی طاقت اسے ذرہ برابر گزند نہیں پہنچاسکے گی۔ ذیل میں اس خطبہ کا اردو ترجمہ پیش کیا جاتا ہے۔[۱۰۶]

> لوگو! میری بات غور سے سنو، میرا خیال ہے کہ شاید اس سال کے بعد اس جگہ پر تم سے نہ مل سکوں اور نہ شاید اس سال کے بعد (آئندہ) حج کرسکوں۔
>
> اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمہارے بہت سے خاندان اور قبیلے بنادیے، تاکہ تم پہچانے جاسکو، یعنی باہم ایک دوسرے کو شناخت کرسکو اور خدا کے نزدیک تم میں

106 حال ہی میں ادارۂ تحقیقات اسلامی اسلام آباد کے زیر اہتمام ادارہ کے فاضل محقق محمد میاں صدیقی صاحب نے خطبہ حجۃ الوداع کے متفرق اجزاء کو یکجا کرکے اس کی اردو شرح کی ہے، میں نے یہ ترتیب اسی سے اخذ کی ہے۔

سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہے۔ کسی کالے کو کسی گورے پر، اور گورے کو کالے پر کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے، فضیلت اور برتری صرف پرہیز گاری کی بناء پر ہے۔

سب لوگ آدم علیہ السلام کی اولاد ہیں اور آدم مٹی سے پیدا کئے گئے ہیں۔ خبردار! خون یا مال کا ہر وہ دعویٰ جس کے لوگ مدعی ہیں، وہ میرے قدموں تلے ہے (میں اسے باطل قرار دیتا ہوں) مگر بیت اللہ کی نگرانی اور حاجیوں کو پانی پلانے کی خدمت حسبِ دستور رہے گی۔

اس کے بعد آپ نے فرمایا:

قیامت کے دن ایسا نہ ہو کہ تم دنیا کا بوجھ اپنی گردنوں پر اٹھائے ہوئے آؤ اور لوگ آخرت کا سامان لے کر آئیں۔ (یاد رکھو) اگر ایسا ہوا تو میں تمہیں اللہ کے عذاب سے نہ بچا سکوں گا۔

خبردار! زمانۂ جاہلیت (قبل از اسلام) کی تمام رسمیں میرے قدموں کے نیچے روند دی گئی ہیں، زمانۂ جاہلیت کے تمام خون (خواہ وہ کسی کے بھی ہوں) سب معاف ہیں، اس سلسلے میں سب سے پہلے اپنے ہی خاندان کا ایک خون جو کہ ربیعہ بن الحارث کے بیٹے کا ہے، معاف کرتا ہوں۔

لوگو! تمہارے اموال اور تمہاری عزت و آبرو قیامت تک ایک دوسرے پر حرام ہیں جس طرح تمہارے اس دن، اس مہینے اور اس شہر کی حرمت واجب ہے اور تم سب عنقریب اپنے پروردگار سے جا ملو گے جہاں تم سے تمہارے اعمال کا محاسبہ ہو گا۔

اے لوگو! تمہاری عورتوں پر تمہارے کچھ حقوق ہیں اور اسی طرح تم پر تمہاری عورتوں کے حقوق ہیں۔ تمہارا ان پر یہ حق ہے کہ وہ کسی ایسے آدمی کو تمہارے بستر پر نہ بیٹھنے دیں جسے تم پسند نہ کرتے ہو، نیز ان پر تمہارا یہ حق ہے کہ وہ کھلی بے حیائی کا کوئی کام نہ کریں، لیکن اگر وہ ایسا کریں تو تمہارے رب نے تمہیں یہ اجازت دی ہے کہ ان کے سونے کی جگہ اپنے سے الگ کر دو، (اگر اس پر بھی باز نہ آئیں) پھر تمہیں اجازت ہے کہ ایسی ہلکی مار مارو جس سے بدن پر نشان نہ پڑیں اور اگر وہ اپنی نازیبا حرکتوں سے باز آجائیں تو حسبِ دستور ان کا کھانا اور کپڑے تمہارے ذمے ہے۔

خبردار! کسی عورت کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ اپنے شوہر کے مال میں سے اس کی اجازت کے بغیر کسی کو کچھ دے، عورتوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنے کے لیے ہمیشہ پابند رہو، کیونکہ وہ تمہاری زیر نگرانی ہیں اور اس حیثیت میں نہیں کہ اپنے معاملات خود چلا سکیں۔ عورتوں کے معاملے میں اللہ سے ڈرتے رہو، تم نے ان کو اللہ تعالیٰ کی امانت کے طور پر حاصل کیا ہے اور اللہ کے کلمات کے ذریعے ان کو اپنے لیے جائز و حلال کیا ہے۔

لوگو! اللہ تعالیٰ نے (میراث کا قانون نازل کر کے) ہر حق دار کو اس کا حق دے دیا ہے، اس لیے اب کسی وارث کے حق میں کوئی وصیت جائز و نافذ نہیں، بچے کا نسب اسی مرد سے ثابت ہو گا جس کی وہ بیوی ہے، جس نے بدکاری کی اس کے لیے سزا ہے (بچہ اس کا نہیں کہلائے گا) اور ان کا حساب کتاب اللہ کے ذمے ہے۔

جس نے اپنے باپ کے علاوہ کسی کی طرف نسبت کی یا کسی غلام نے اپنے کو کسی دوسرے مالک کی طرف منسوب کیا اس پر خدا کی لعنت ہے۔

قرض ادا کیا جائے گا، عاریت واپس کی جائے گی، ضامن تاوان کا ذمہ دار ہے، خبر دار! جرم کرنے والا خود اپنے جرم کا ذمہ دار ہے۔ باپ کے جرم کا ذمہ دار بیٹا نہیں، اور بیٹے کے جرم کا ذمہ دار باپ نہیں۔

کسی شخص کے لیے بھائی کی کوئی چیز لینا جائز نہیں، البتہ اس صورت میں جائز ہے کہ وہ خوشدلی کے ساتھ دے، پس تم لوگ اپنے اوپر ظلم وزیادتی نہ کرو۔

لوگو! ہر مسلمان، دوسرے مسلمان کا بھائی ہے اور سب مسلمان آپس میں ایک دوسرے کے بھائی بھائی ہیں۔

تمہارے غلام، تمہارے غلام ہیں، تم خود جو کچھ کھاتے ہو، ان کو بھی کھلاؤ اور جو خود پہنتے ہو وہی انہیں بھی پہناؤ۔

خبر دار! میرے بعد گمراہ (یا کافر) نہ ہو جانا کہ ایک دوسرے کی گردنیں مارنے لگو، جس شخص کے پاس کسی کی امانت ہو، اس پر لازم ہے کہ وہ امانت والے کو ٹھیک ٹھاک طریقے سے لوٹا دے۔

اگر کوئی نکٹا اور سیاہ فام حبشی غلام بھی تمہارا امیر بنا دیا جائے اور وہ کتاب اللہ (قرآن مجید) کے مطابق تمہاری قیادت کرے تو تم پر اس کی اطاعت لازم ہے۔

اے لوگو! میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے اور تمہارے بعد کوئی نئی امت نہیں ہے۔

میں تم میں ایک نعمت چھوڑے جا رہا ہوں، اگر تم مضبوطی سے اسے تھامے رہو گے تو کبھی گمراہ نہ گے اور وہ نعمت اللہ کی کتاب قرآن مجید ہے۔

لوگو! مذہب میں غُلوّ اور مبالغہ سے بچو، کیوں کہ تم سے پہلے بہت سی قومیں مذہب میں غُلوّ کے سبب برباد ہو گئیں۔

اے لوگو! اب شیطان اس بات سے مایوس ہو چکا کہ اس سرزمین پر اس کی پرستش ہو گی، لیکن عبادات کے سوا دوسرے معاملات میں اپنے پست افعال کے ذریعے اس کی فرمانبرداری کی گئی تو وہ اس پر بھی راضی رہے گا۔ پس تم اپنے دین کو اس سے بچا کر رکھنا۔

خبردار! اپنے رب کی عبادت کرتے رہو، پنج وقتہ نمازوں کی پابندی کرو، ماہ رمضان کے روزے رکھو۔ اپنے اموال کی خوش دلی کے ساتھ زکوٰۃ ادا کرتے رہو، اپنے رب کے گھر (بیت اللہ) کا طواف کرو، اپنے امراء کے حکم کی پیروی کرو، اپنے رب کی جنت میں داخل ہو جاؤ گے۔

اے لوگو! نسیٔ[107] کفر کی زیادتی کا سبب ہے، اس کے ذریعے کفار گمراہ ہوتے ہیں۔ وہ ایک سال حرام مہینوں کو حلال کر لیتے ہیں اور دوسرے سال انہی کو حرام قرار دے لیتے ہیں، تاکہ اس طرح حرام مہینوں کی گنتی پوری کریں لیکن اب زمانہ اپنی اس ابتدائی حالت پر لوٹ آیا ہے جس دن اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان کو پیدا فرمایا تھا۔ اللہ

---

107 زمانہ جاہلیت میں عرب حلال و حرام مہینوں کو آگے پیچھے کر کے ان میں ردوبدل کر لیا کرتے تھے، اسے نسی کہا جاتا تھا۔

کے نزدیک سال کے بارہ مہینے ہوتے ہیں جن میں سے چار مہینے حرمت والے ہیں، تین مہینے مسلسل ہیں (ذی قعدہ، ذی الحجہ، محرم) اور ایک ماہ رجب ہے جو جمادی الثانی اور شعبان کے درمیان واقع ہے۔

خبردار! جو لوگ یہاں موجود ہیں وہ میری بات ان لوگوں تک پہنچا دیں جو یہاں موجود نہیں ہیں کیونکہ بہت سے لوگ جن کو میرا پیغام پہنچے گا وہ ان لوگوں سے زیادہ اسے محفوظ رکھنے والے ہوں گے جو اس وقت سننے والے ہیں۔

تم لوگوں سے میرے متعلق بھی پوچھا جائے گا، بتاؤ تم میرے بارے میں کیا کہو گے؟ حاضرین نے (ایک زبان ہو کر) عرض کیا! ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ نے امانت کو ادا کر دیا اللہ کا پیغام پہنچا دیا اور نصیحت کر دی۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے اپنی انگلی آسمان کی جانب بلند فرما کر تین مرتبہ فرمایا۔ اے اللہ تو گواہ رہنا!

جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ فرضیت حج کے بعد حضور ﷺ کا یہ پہلا اور آخری حج تھا۔ اس لیے آپ نے اس موقعہ پر موجود اور غیر موجود سب کے لیے واضح ہدایات جاری فرمائیں۔ سرور عالم ﷺ کی حیات طیبہ کا ہر لمحہ آپ کے زریں فرمودات کے ترجمان کی حیثیت رکھتا ہے۔ آپ ﷺ کی شخصیت قول و فعل کی ہم آہنگی کا ایک عظیم مظہر ہے۔ تاریخ انسانیت میں ہمیں بے شمار مصلح نظر آتے ہیں، جنھوں نے انسانیت کی فلاح اور روشن مستقبل کے لیے بڑے عمدہ اصول پیش کئے ہیں، لیکن جب ہم ان کی عملی زندگی پر نگاہ ڈالتے ہیں تو عمل کا خانہ خالی نظر آتا، اس کے برعکس نبی آخر الزمان جناب محمد رسول اللہ ﷺ کی حیات طیبہ کے کسی گوشہ میں بنظر غائر دیکھ لیجئے، حضرت محمد ﷺ نے جو

فرمایا اس پر عمل کر کے دکھایا۔ بہت سے لوگوں نے غریبوں، مظلوموں کے حق میں آواز بلند کی، لیکن ان کی اپنی ساری عمر عیش و عشرت میں گزر گئی، جو شخص کبھی خود فاقہ کی حالت سے نہ گزرا ہو، اسے کیا معلوم فاقے کی شدت کیا ہوتی ہے۔ جس نے خود کبھی مصائب و آلام کے پہاڑ عبور نہ کیے ہوں، اسے کیا معلوم کہ مصیبت زدگان کس کیفیت سے دوچار ہوتے ہیں۔ جو خود کبھی بے گھر نہ ہوا ہو، اسے کیا معلوم کہ بے گھروں کو کن حالات سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے مفکرین نے اصول تو پیش کر دیے مگر اپنے ہی دیے ہوئے اصولوں پر عمل پیرا نہ ہو سکے۔ مگر اس کے برعکس جناب محمد رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ پر نگاہ دوڑائیے تو قول و فعل یک جا نظر آئیں گے۔

سرورِ عالم ﷺ نے غریب و امیر کے فرق اور آقا و غلام کے امتیاز کو ختم کرنے کا اعلان فرمایا تو چشمِ فلک پیر نے حجۃ الوداع کے موقع پر یہ نظارہ بھی کیا کہ سید المرسلین ﷺ خطبہ حجۃ الوداع دینے کے لیے تشریف لا رہے ہیں اور ایک آزاد شدہ غلام حضرت بلال حبشی اونٹنی کی مہار پکڑے ہوئے ہیں اور جب خطبے کا آغاز ہوا تو ایک اور آزاد شدہ غلام حضرت اسامہ آپ کو دھوپ کی تمازت سے بچانے کے لیے سر پر سایہ کئے کھڑے ہیں۔

الغرض آپ خطبہ حجۃ الوداع کو پڑھیے اور دیکھیئے کہ سرورِ عالم ﷺ ہر حکم اور نصیحت کے ساتھ اپنے عمل کا نمونہ پیش فرما رہے ہیں۔

چنانچہ اس خطبہ حجۃ الوداع کے موقعہ پر جب آپ نے قول و فعل سے تکمیل شریعت کا عظیم کارنامہ سرانجام دیا تو آیہ کریمہ نازل ہوئی:

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا[108]

---

108 المائدہ: ۳

آج میں تم کو پورا دے چکا دین تمہارا، اور پورا کیا تم پر میں نے احسان
اپنا اور پسند کیا میں نے تمہارے واسطے اسلام۔

وفات النبی ﷺ

ماہ صفر ۱۱ھ کو آنحضرت ﷺ کو درد سر کی شکایت ہوئی اور یہیں سے آپ کی علالت کی ابتداء ہوئی۔ بیماری کی حالت میں بھی حق و انصاف کے معلم اعظم ﷺ حسبِ معمول باری باری ازواج مطہرات کے ہاں قیام فرماتے، لیکن مرض جب شدت اختیار کر گیا تو دیگر ازواج مطہرات کی اجازت سے آپ ﷺ نے حضرت عائشہ کے حجرہ میں قیام فرمایا۔

جب تک طاقت رہی آپ مسجد میں جا کر نماز پڑھتے رہے۔ آخری نماز مغرب کی تھی جو آپ کے جاں نثاروں نے آپ کی امامت میں ادا کی۔ آپ ﷺ کے حکم سے سیدنا صدیق اکبر نے امامت کے فرائض سر انجام دیے۔ ایک روز ذرا افاقہ محسوس ہوا تو مسجد میں تشریف لے آئے۔ حضرت صدیق اکبرؓ نے پیچھے ہٹنا چاہا مگر آپ نے اشارے سے روک دیا۔ چنانچہ حضرت صدیق اکبرؓ نے آپ کی اقتداء کی اور باقی صحابہ نے حضرت صدیق اکبرؓ کو دیکھ کر نماز ادا کی۔ اس نماز کے بعد آپ نے آخری خطبہ ارشاد فرمایا:

فرمایا: سب سے زیادہ میں جس کی دولت اور صحبت کا ممنون ہوں، وہ ابو بکر ہیں، اگر میں دنیا میں کسی کو اپنی امت میں سے دوست بنا سکتا تو ابو بکر کو بناتا لیکن اسلام کا رشتہ دوستوں کے لیے کافی ہے۔ مسجد کے رُخ کوئی دریچہ ابو بکر کے دریچہ کے سوا باقی نہ رکھا جائے۔ ہاں تم سے پہلی قوموں نے اپنے پیغمبروں اور بزرگوں کی قبروں کو عبادت گاہ بنا لیا ہے، دیکھو تم ایسا نہ کرنا، میں منع کر جاتا ہوں۔

آنحضرت ﷺ نے وفات سے پہلے رومیوں کی سرکوبی کے لیے ایک لشکر

ترتیب دیا۔ اسامہ بن زیدؓ کو لشکر کی سپہ سالاری سونپی گئی مگر آپ کی وفات کی وجہ سے اس لشکر کی روانگی ملتوی ہو گئی اور حضرت صدیق اکبرؓ کے عہد میں حضور ﷺ کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے اس لشکر کو اس مہم پر روانہ کیا گیا۔

سرورِ عالم ﷺ کا مرض شدت اختیار کرتا گیا اور بالآخر وہ گھڑی آ پہنچی کہ دنیائے انسانیت کا آخری نبی اس جہانِ فانی سے روپوش ہو گیا۔ اس روح فرسا واقعہ نے دنیا والوں کو انوارِ نبوت سے محروم کر دیا۔ تاریخ وفات میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ مختلف اقوال منقول ہیں۔ مثلاً ۱۲ ربیع الاول، یکم ربیع الاول اور ۲ ربیع الاول کی تاریخیں بتائی گئی ہیں۔ حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے شرح بخاری میں اس آخری قول کو ترجیح دی ہے۔

رسول اکرم ﷺ کی وفات کی خبر نے صحابہؓ کے دلوں کو ہلا کر رکھ دیا۔ غم والم کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ حضرت عمر تو وارفتگی میں ننگی تلوار لیے فرما رہے تھے کہ اگر کسی نے یہ کہنے کی جرأت کی کہ آنحضرت ﷺ کی وفات ہو گئی ہے تو اس کا سر قلم کر دوں گا۔ اتنے میں رفیقِ نبوت حضرت صدیق اکبرؓ کی آمد ہوئی (آپ مدینہ سے ایک کوس کے فاصلے پر مقیم تھے) آپ سیدھے حجرۂ اقدس میں تشریف لے گئے، پیشانی مبارک کو بوسہ دیا اور کہا کہ میرے ماں باپ آپ پر فدا ہوں، خدا کی قسم! اللہ تعالیٰ آپ کو دو مرتبہ موت کا مزا نہیں چکھائے گا، جو موت آپ کے لیے لکھی تھی وہ آ چکی، یہ کہہ کر آپ حجرۂ اقدس سے باہر تشریف لے آئے اور ایک تاریخی خطبہ ارشاد فرمایا جس سے تمام صحابہ کرام مطمئن ہو گئے۔

خطبے میں آپ نے صحابہؓ سے مخاطب ہو کر ارشاد فرمایا:

مَنْ كَانَ يَعْبُدُ مُحَمَّداً فَاِنَّ مُحَمَّدَ قَدْ مَاتَ وَ مَنْ كَانَ يَعْبُدُ اللهَ فَاِنَّ اللهَ حَيٌّ لَّا يَمُوتُ[109]

---

109 صحیح بخاری، جلد ۶، ص:۱۷

تم میں سے جو محمد ﷺ کی عبادت کرتا ہے جان لے کہ (حضرت) محمد ﷺ کا انتقال ہو گیا ہے اور جو اللہ کی عبادت کرتا ہے تو بے شک اللہ زندہ ہے کبھی نہیں مرے گا، اس کے بعد آپ نے کلام مجید کی یہ آیت ارشاد فرمائی:

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ اَفَاۡئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ ؕ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْـًٔا ؕ وَسَيَجْزِى اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ[110]

محمد ایک رسول ہی تھے، ان سے پہلے کئی رسول گزرے، پس اگر وہ مر جائیں یا قتل ہو جائیں تو کیا تم الٹے پاؤں لوٹ جاؤ گے اور جو شخص الٹے پاؤں لوٹ جائے گا وہ اللہ کا کوئی نقصان نہیں کرے گا۔

اس تقریر کو سن کر مضطرب صحابہ کرام کے دلوں کو ایک گونہ سکون نصیب ہوا۔ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ "مجھے یوں محسوس ہوا کہ میں نے آج ان آیتوں کو پڑھا ہے"۔

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰی آلِ مُحَمَّدٍ

اخلاق حسنہ کا نمونہ کامل

دنیا میں دو چیزیں اپنے اندر بڑی قوت اور کشش رکھتی ہیں۔ ایک حسنِ صورت اور ایک حسنِ سیرت۔ اور جب حسن صورت اور حسن سیرت کا امتزاج پیدا ہو جائے تو پھر اس سے بڑی دنیا میں کوئی چیز نہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ حسنِ صورت و سیرت کا جو امتزاج ہمارے آقا و مولیٰ جناب محمد رسول اللہ ﷺ میں پیدا ہوا، چشم فلک نے نہ کبھی پہلے دیکھا اور نہ آئندہ دیکھے گا۔ ارشاد خداوندی ہے:

---

110 آل عمران: ۱۴۴ (بحوالہ بخاری)

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ"[111]

یعنی اس کائناتِ انسانی میں بسنے والا جو شخص بھی فوز و فلاح کی زندگی گزارنے کا خواہشمند ہو، جو بھی سلیم الطبع آدمی زندگی کی راہ کو کامیابی کے ساتھ طے کرنا چاہتا ہو، وہ سرورِ عالم ﷺ کی حیات طیبہ کی روشنی سے راہِ ہدایت حاصل کر لے۔

یہ آیتِ کریمہ آپ ﷺ کی شان میں نازل ہوئی ہے۔ لہٰذا شعبہ ہائے حیات میں سے کسی بھی شعبے سے تعلق رکھنے والا ہر شخص آپ سے رہبری و رہنمائی حاصل کر سکتا ہے اور یقین جانیے کہ جو بھی درِ مصطفیٰ ﷺ پر راہنمائی کا طالب بن کر جائے گا، وہ ضرور نورِ نبوت سے مستنیر ہو گا۔ آپ ﷺ کی حیات طیبہ سے روشنی حاصل کرنے کا خواہشمند سیرت طیبہ میں کسی جگہ تاریکی کا نشان نہیں پائے گا۔ آپ کی حیات طیبہ کا ہر ہر لمحہ واضح اور روشن ہے۔ ہر چیز واضح اور چمکتے ہوئے آفتاب کی مانند ہے۔

دنیا میں بے شمار ریفارمرز اور مصلح گزرے ہیں جنہوں نے انسانیت کی فلاح کے لیے بہت خوبصورت نظریے پیش کیے ہیں، لیکن یہ لوگ اپنے وضع کردہ خوبصورت اصولوں کو عملی جامہ نہ پہنا سکے۔ پوری نسلِ انسانی میں انبیاءؑ کا گروہ ایک ایسا ہے جو علم کے ساتھ عمل کا نمونہ پیش کرتا تھا لیکن گزشتہ انبیاءؑ چونکہ مختلف قوموں، طبقوں، نسلوں اور مخصوص زمانوں کے لیے مبعوث ہوئے تھے، اس لیے ان کی تعلیمات کا دائرہ بھی ایک مخصوص قوم یا زمانہ تک محدود نہ تھا۔ نبی آخر الزمان جناب محمد رسول اللہ ﷺ کی شریعت وہ آخری شریعت ہے جو نسلِ انسانی کے تمام تر دکھوں کا مداوا اور جملہ مسائل کا حل ہے، خدا نے اپنے آخری پیغمبر کے واسطے سے دنیا والوں کے لیے اپنا آخری دستور نازل فرمایا۔ اور خلقِ عظیم کے مظہر اتم جناب محمد رسول اللہ ﷺ نے بہترین اخلاقی تعلیمات کا

---

111 الاحزاب:۲۱

بہترین نمونہ پیش کر دیا۔ چنانچہ خداوند بزرگ و برتر نے آپ کی حیاتِ طیبہ کو منکرین توحید و رسالت کے سامنے بطور دلیل پیش کیا جس کا ذکر قرآن مجید میں ان الفاظ میں مذکور ہے:

فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِّن قَبْلِهِ ۚ أَفَلَا تَعْقِلُونَ "[112]

وہ لوگ جو آنحضرت ﷺ کی رسالت کا انکار کرتے تھے۔ ان کے جواب میں اس سے زیادہ مسکت دلیل نہیں دی جاسکتی تھی۔ سرور عالم ﷺ نے ان سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ میں تم میں کوئی نووارد آدمی نہیں ہوں، جس کے ماضی و حاضر سے تم بے خبر ہو، میں تمہارے اندر زندگی کے چالیس سال گزار چکا ہوں۔ اس طویل مدت میں تم نے میری طرف سے کسی جھوٹ یا فریب کا تجربہ کیا ہے، کب تم نے میرے اندر سیادت و امارت کی بُو محسوس کی ہے، میرا بچپن، میری جوانی تم لوگوں کی نظروں کے سامنے گذری، کب تم نے مجھے بھٹکا ہوا پایا؟ خدا گواہ ہے اس سوال کا جواب کسی بڑے سے بڑے کافر کے پاس نہیں تھا بلکہ اس کے برعکس جب ہم مکی زندگی کا مطالعہ کرتے ہیں تو سیرتِ مصطفیٰ کا یہ اعجاز دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے کہ آپ کی جان کے دشمن آپ کو "الامین" کے لقب سے پکارتے ہیں، آپ کے راستوں میں کانٹے بچھانے والے، آپ کے قتل کی سازشیں تیار کرنے والے اپنی امانتوں کی حفاظت کے لیے آپ سے زیادہ کوئی محفوظ مقام نہیں پاتے، اور کیوں نہ ہو رسول اللہ ﷺ کا عمل ہی ایسا تھا۔ اندازہ فرمایئے کہ مکہ والوں کی ایذا اور ستم ظریفی کے نتیجے میں آپ مکے کو الوداع کہہ رہے تھے اور ساتھ ہی حضرت علیؓ کو دشمنوں کے نرغے میں محض اس لیے چھوڑ کر جارہے تھے کہ وہ مکہ والوں کی امانتیں واپس کر کے مدینے تشریف لائیں۔

عام حالات میں یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ لوگ دوسروں سے اپنی فضیلت کا لوہا منوا

---

112 یونس:١٦

لیتے ہیں لیکن وہ لوگ جنہیں ان کا قرب حاصل ہوتا ہے، جو ان کی خلوت و جلوت کے رازداں ہوتے ہیں وہ ان کی عظمت کے معترف نہیں ہوتے۔ اس کی واضح اور غیر مبہم وجہ صرف ایک ہی ہے کہ ان لوگوں کی زندگی عمل سے یکسر خالی ہوتی ہے۔ اس لیے وہ ساری دنیا کے ہیرو بن جاتے ہیں مگر اپنے گھر کے ہیرو نہیں بن سکتے۔ اس کے برعکس سیرتِ طیبہ جناب محمد رسول اللہ ﷺ کی اعزازی صفت دیکھیے کہ آپ پر سب سے پہلے ایمان لانے کی سعادت ان لوگوں کے حصے میں آئی جو آپ کے سب سے زیادہ قریب تھے۔ آپ کی رفیقہ زندگی حضرت خدیجہ ایمان لانے میں سبقت لے گئیں۔ حضرت صدیق اکبرؓ، حضرت علی المرتضیٰؓ یہ وہ لوگ ہیں جو آنحضرت ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے گوشے گوشے سے واقف و آشنا تھے۔ چنانچہ انہیں ایمان لانے میں ذرہ برابر تردد نہ ہوا اور کیوں ہوتا؟ یہ لوگ بخوبی جانتے تھے کہ دعویٰ نبوت کرنے والا شخص وہ ہے جس نے کبھی کسی انسان سے متعلق جھوٹ نہیں بولا، بھلا وہ شخص خدا کے متعلق کیسے جھوٹ کہہ سکتا ہے۔

آپ ﷺ کی سیرت طیبہ کا سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ آپ نے صرف حکم دینے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ عملی نمونہ پیش کیا۔ قرآن مجید جو اخلاقِ حسنہ کی سب سے آخری الہامی کتاب ہے، اس کے ایک ایک لفظ اور ایک ایک حرف کی عملی تفسیر جناب محمد رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ مقدسہ ہے اور یہی وہ حقیقت ہے جس کی طرف حضرت عائشہ صدیقہؓ نے واضح اشارہ فرمایا ہے "کان خلقہ القرآن"[113] (آپ کے اخلاق تو قرآن کریم ہیں) اور یہ قطعاً مبالغہ نہیں کہ اگر کوئی شخص سیرتِ مصطفیٰ ﷺ سے بے نیاز ہو کر مفاہیم قرآن سمجھنا چاہے تو یہ مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔ اس کی دو مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔ قرآن کریم میں ارشاد خداوندی ہے "وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ" (نماز قائم کرو) عربی زبان میں صلوٰۃ کے معنی دعا

---

113 شرح جامع الصغیر جلد ۲، صفحہ ۱۷۷

کے ہیں۔اب الصلوٰۃ سے یہ قیام، رکوع و سجود مراد لینا کیونکر ممکن ہے۔ مقصد یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کے عمل کو پیشِ نظر رکھے بغیر منشاء ایزدی تک رسائی طاقتِ بشر سے باہر ہے۔ نماز کی طرح قرآن مجید میں ایک حکم نازل ہوا "وَاَتِمُّوا الْحَجَّ" (اور حج کرو)۔حج کے لفظی معنی "ارادہ" کے ہیں۔اب حضور ﷺ کے عمل کو دیکھے بغیر حج سے متعلق جملہ تفصیلات سے آگاہی کیوں کر ہو سکتی ہے۔ الغرض حضور ﷺ اور قرآن یوں باہم منسلک ہیں کہ ایک کو چھوڑ کر دوسرے سے مستفید ہونا ناممکن ہے۔

دورِ حاضر میں ہم کلمہ پڑھنے کے باوجود حضور ﷺ کی کامل رہبری و رہنمائی سے مستفید نہیں ہو رہے، مشرق و مغرب کی دریوزہ گری ہماری عادتِ ثانیہ بن چکی ہے۔ہم معیشت کے اصول کہیں سے ادھار مانگ رہے ہیں اور اصولِ سیاست میں کسی اور طرف نظرِ التفات کیے ہوئے ہیں اور اس حقیقت سے بے خبر ہیں کہ ہمارے آقا جناب محمد رسول اللہ ﷺ ہیں۔ہمارے لیے روشنی کا معیار ذاتِ مصطفیٰ ہے اگر اس روشنی میں ہم اپنے مسائل کا حل تلاش کریں گے تو یقیناً کامیابی ہمارے قدم چومے گی۔ آپ ﷺ کا شخصی کردار ہماری ذات کی اصلاح کے لیے نمونہ کامل کی صورت میں موجود ہے۔رحمت و رأفت، شفقت و خشیت، عبادت و شجاعت، عدالت و صداقت، تواضع، صبر، توکل ثبات، دانش مندی الغرض وہ تمام اوصافِ حمیدہ جو شخصیت سازی کے لیے ضروری ہیں، آنحضرت ﷺ کی حیات طیبہ میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔سب کی کیفیات اور عملی نمونے موجود ہیں۔ معاشرے کی تشکیل کے لیے ایک اچھے دوست، شفیق و مہربان سردار، مساکین کے غمگسار، کی حیثیت سے آپ کے اخلاقِ حسنہ کا عمدہ نمونہ سیرت طیبہ میں محفوظ ہے۔اسی طرح ملی و قومی زندگی میں عدل و انصاف، انتظاماتِ حکومت اور فکر و تدبر کی روشن جھلکیاں ہماری راہبری و راہنمائی کے لیے آپ کی ذاتِ ستودہ صفات میں موجود تھیں۔آپ کی حیات طیبہ قیامت تک کی نسلِ انسانی کے لیے نمونہ کامل کی حیثیت رکھتی ہے۔جو شخص بھی حقیقی فلاح

کا طالب ہو گا، اسے اسی "سراجاً منیراً" کی روشنی میں راہِ ہدایت پر گامزن ہونا پڑے گا۔ تب مقصدِ حقیقی سے ہمکنار ہو گا۔

حُبِّ رسول و اطاعتِ رسول ﷺ

کسی بھی مومن کا ایمان مکمل نہیں ہو سکتا تا آنکہ وہ محبتِ محمد عربی ﷺ کے جذبۂ اطاعت سے سرشار نہ ہو۔ قرآن مجید، فرقان حمید میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ [114]

پس جو لوگ ایمان لائے ان (نبی اکرم) پر جنہوں نے ان (نبی اکرم) کی توقیر و تعظیم کی اور جذبۂ احترام کے ساتھ جنہوں نے ان (نبی اکرم) کی مدد و حمایت کی۔ ان کے کام میں جانثارانہ تعاون کیا، اپنی قوتوں اور صلاحیتوں کو صرف کیا اور جنہوں نے اس نور اور روشنی کا اتباع کیا، پیروی کی جو ان کے ساتھ نازل کی گئی ہے تو یہی ہیں وہ لوگ جو خدا کے ہاں فلاح پانے والے، کامیاب ہونے والے اور کامران و شادکام ہونے والے قرار پائیں گے۔

اس آیتِ کریمہ کی روشنی میں چار چیزیں سامنے آتی ہیں:

۱۔ آنحضرت ﷺ کی رسالت پر ایمان

۲۔ آپ کی توقیر و تعظیم

۳۔ حضور ﷺ کی نصرت و حمایت

۴۔ اتباعِ قرآن مجید

---

114 الاعراف:۱۵۷

آیتِ کریمہ کی ترتیب سے صاف واضح ہے کہ ایمان کے بعد جو چیز ضروری ہے وہ آنحضرت ﷺ کی توقیر و تعظیم ہے، آپ سے محبت ہے، آپ سے والہانہ لگاؤ ہے، حُبِ رسول وہ مُحرِک ہے جس سے اطاعت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے، جو دل محبت کے جذبات سے خالی ہو وہاں اطاعت کے جذبات کا پیدا ہونا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔ وہاں وقتی طور پر کسی مصلحت کے تحت، کسی خارجی دباؤ میں آکر کوئی شخص کسی کا مطیع و فرمانبردار بن سکتا ہے مگر یہ اطاعت پائیدار نہیں ہوتی۔ جونہی وہ خارجی دباؤ ختم ہو گا، وہ شخص اطاعت کا خول بھی اتار کر پھینک دے گا لیکن جو شخص محبت کے نشے میں چور ہو کر کسی کی اطاعت و فرمانبرداری کا طوق اپنے گلے میں پہنے گا تو اس کی یہ تابعداری کبھی ختم نہیں ہو گی، چنانچہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے جنابِ محمد رسول اللہ ﷺ کی ایسی ہی اطاعت چاہتے ہیں جو محبت سے مغلوب ہو کر کی جائے، جسے کبھی زوال نہ آئے، جو غیر مشروط ہو، جو دنیا کی تمام محبتوں پر حاوی ہو۔

بخاری شریف میں حضرت عبد اللہ بن ہشام سے روایت ہے:

كُنَّا مَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَهُوَ آخِذٌ بِيَدِ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ فَقَالَ لَهٗ عُمَرُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ لَاَنْتَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَحَبُّ اِلَيَّ مِنْ شَيْئٍ اِلٰى مِنْ كُلِّ شَيْئٍ بِيَدِهٖ حَتّٰى اَكُوْنَ اِلَيْكَ مِنْ نَفْسِكَ فَقَالَ عُمَرُ فَاِنَّكَ الْاٰنَ وَاللّٰهِ اَحَبُّ اِلَيَّ مِنْ نَفْسِيْ فَقَالَ نَعَمْ يَا عُمَرُ[115]

ہم آنحضرت ﷺ کے ساتھ تھے، آپ عمر کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیے ہوئے تھے۔ عمر نے آپ سے عرض کیا۔ یا رسول اللہ ﷺ آپ مجھے اپنی جان کے سوا ہر چیز سے زیادہ محبوب ہیں۔ آپ نے فرمایا

---

115 سیرۃ المصطفیٰ۔ جلد نمبر ۲، صفحہ ۳۴۴

اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے، جب تک میں تم کو اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز نہ ہو جاؤں تم مومن نہیں ہو گے۔ پس عمر نے عرض کیا آپ مجھے اپنی ذات سے بھی زیادہ عزیز ہو گئے۔ آپ نے فرمایا، ہاں اب اے عمر (ایمان مکمل ہو گیا)۔

حضرت فاروق اعظمؓ تو فنا فی الرّسول کے اس مقام پر فائز تھے کہ وفاتِ رسول پر ہاتھ میں ننگی تلوار لیے کھڑے تھے کہ جو شخص یہ کہے گا کہ آنحضرت ﷺ پر موت واقع ہو گئی ہے، اس کا سر قلم کر دوں گا۔

آپ ﷺ کے صحابہ کرام کی سیرتوں میں محبتِ رسول ﷺ کے وہ جلوے نظر آتے ہیں کہ دنیائے محبت میں اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ صلح حدیبیہ کے موقع پر عُروہ بن مسعود ثقفی قریش کے سفیر کی حیثیت سے بارگاہِ رسالت مآب ﷺ میں حاضر ہوئے۔ یہاں انہوں نے محبت رسول کے جو مناظر دیکھے، انہیں خود اپنی زبان سے قریش کے سامنے ان الفاظ میں بیان کیا:

لوگو! خدا کی قسم مجھے بادشاہوں کے دربار میں بھی باریابی کا موقع ملا ہے۔ قیصر و کسریٰ کے دربار میں بھی حاضر ہوا ہوں۔ قسم خدا کی میں نے کسی بادشاہ کو نہیں دیکھا جس کی لوگ اتنی عزت کرتے ہوں جتنی محمد (ﷺ) کے ساتھی محمد (ﷺ) کی کرتے ہیں۔ قسم خدا کی جب وہ بلغم تھوکتے ہیں تو نہیں گرتا ہے لیکن ان کے ساتھیوں میں سے کسی کے ہاتھ پر، پھر وہ اسے اپنے چہرہ پر اور بدن پر مل لیتا ہے۔ محمد (ﷺ) جب کسی بات کا انہیں حکم دیتے ہیں تو اس کی تعمیل کی طرف جھپٹ پڑتے ہیں۔ جب محمد (ﷺ) بات کرتے ہیں تو ان کی آوازیں پست ہو جاتی ہیں، محمد (ﷺ) کو نگاہ بھر کر ان کی عظمت

کی وجہ سے نہیں دیکھ سکتے۔"[116]

اصحابِ رسول کو آنحضرت ﷺ سے محبت ایک اتنا روشن اور طویل باب ہے، جس کا قلم و قرطاس احاطہ کرنے سے قاصر و عاجز ہیں۔ ایک ایک صحابی آنحضرت ﷺ کا گرویدہ تھا۔ آپ کی محبت میں جان دیتا تھا۔ ہمہ وقت دنیا ومافیہا کو آپ کی ذاتِ شریفہ پر نثار کرنے کے لیے تیار رہتا تھا، لیکن مجھے اس موقع پر اس بات کا اظہار کرنا بھی مقصود ہے کہ صحابہؓ کی محبت کے ساتھ ان کی اطاعتِ رسول کے نقوش بھی بے مثال ہیں۔ محبت اور اطاعت لازم وملزوم ہیں، ایسی محبت جو اطاعت کے جذبے سے خالی ہو وہ منافقت ہے محبت نہیں، اور بالکل اسی طرح جو اطاعت محبتِ رسول کے جذبات سے تہی دست ہو، وہ خدا کے ہاں مقبول نہیں۔ محبت کا تقاضا یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کے ہر حکم کی پیروی کی جائے۔ آپ کی ہر ادا کو اپنایا جائے، اپنی سیاست، معیشت، خانگی زندگی، اجتماعی زندگی، غرض زندگی کے ہر زاویے کو سنت محمدی کے رنگ میں رنگ دیا جائے۔ ہمارا دعویٰ یہ ہو کہ ہم محبت رسول سے سرشار ہیں، لیکن ہمارے عمل سے سنتِ رسول کی کوئی جھلک نظر نہ آئے، ہماری تعلیم فرنگی ہو، ہماری بودوباش غیروں کے طرز پر ہو، ہماری سیاست غیروں کے نظریات پر مبنی ہو، نظامِ معیشت میں دشمنانِ رسول کے اصول کارفرماہوں تو ایسی محبت کو کیا کہا جائے گا؟

محبت کا منظر تو مدینہ طیبہ میں نظر آتا ہے۔ امتناعِ شراب کا حکم ملتا ہے تو جو شراب ہونٹوں پر ہوتی ہے اسے تھوک دیا جاتا ہے اور جو برتنوں میں ہوتی ہے اسے انڈیل دیا جاتا ہے اور یوں مدینہ کی گلیوں میں شراب پانی کی طرح بہتی نظر آتی ہے۔

وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۚ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ"[117]

---

116 سیرۃ المصطفیٰ۔ جلد نمبر ۲، صفحہ ۳۴۴

رسول جس چیز کا حکم دیں اسے لے لو اور جس سے منع کریں اس سے رک جاؤ۔

صحابہؓ کرام اس آیتِ کریمہ کی عملی تفسیر تھے۔ ان کی زندگی کی ایک ہی خواہش ہوتی تھی کہ جئیں تو محمد عربی ﷺ کی زیارت سے مشرف ہوتے رہیں، آپ کے احکام کی تعمیل کرتے رہیں، آپ کے لائے ہوئے دینِ متین کی ترویج و اشاعت میں معین و مددگار بنے رہیں اور جب موت آئے تو ہمارا سر ہمارے آقا ﷺ کے قدموں میں ہو۔

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ[118]

جس نے رسول کی اطاعت کی گویا اس نے اللہ کی اطاعت کی۔

صحابہ کرام اس آیہ کریمہ پر محکم یقین کے ساتھ جذبہ عقیدت سے سرشار ہو کر آپ کی ہر ہر ادا کو اپنانے پر کمربستہ رہتے تھے، آپ کے ہر فیصلے پر سر تسلم خم کرتے تھے اور بلاشبہ رسول ﷺ بھیجے ہی اسی لیے گئے ہیں کہ ان کی اطاعت کی جائے، ان کے احکام کو بلا چون وچرا تسلیم کیا جائے۔ ارشاد خداوندی ہے:

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ[119]

اور نہیں رسول بھیجے جاتے مگر اس لیے کہ ان کی پیروی کی جائے۔

رسول کے بتائے ہوئے طریقے سے سر مو انحراف کر کے کوئی بھی شخص قربِ الٰہی کی منزل میں قدم نہیں رکھ سکتا، آنحضرت ﷺ کے بتائے ہوئے طریقے کے خلاف کوئی بھی شخص ساری عمر بارگاہِ رب العزت میں سر رگڑتا رہے، عجز و نیاز کے آنسو بہاتا رہے

---

117 الحشر:۷

118 النساء:۸۰

119 النسآء:۶۴

مگر خدا کے ہاں اس کی کوئی شنوائی نہیں، خدا کے ہاں وہی عبادت قبول ہے، اسی عمل کو قبولیت کا درجہ حاصل ہے جو آنحضرت ﷺ کی متابعت میں کیا جائے۔

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ[120]

فرما دیجیے کہ اگر تم اللہ کی محبت و قرب حاصل کرنا چاہتے تو میری تابعداری کرو، خدا خود تم سے محبت کرے گا۔

آیتِ کریمہ میں واضح کر دیا گیا کہ قربِ الٰہی کا زینہ اطاعتِ رسول ہے، ایسی اطاعت جو محبت سے سرشار ہو، اور حبِّ رسول و اطاعت رسول کی دولت میسر آگئی تو خدا خود ایسے بندگان سے محبت کرنے کا اعلان کر رہا ہے۔ خداوند بزرگ و برتر رسول اللہ ﷺ سے محبت کا حکم دیتا ہے مگر اطاعت کے ساتھ اور وہ اطاعت اسے قطعاً قبول نہیں جو محبت سے خالی ہو۔

تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ جن لوگوں کو محبتِ رسول ﷺ کے ساتھ اطاعت رسول ﷺ کی دولتِ لازوال میسر آگئی، تاریخ ان کا ہمسر پیدا نہ کر سکی، جس نے جس شعبے میں قدم رکھا اس کا امام بن گیا۔ صدیاں گزرنے کے باوجود زمانہ ان کی مثال پیش کرنے میں معذور نظر آتا ہے، صدیق اکبرؓ اور فاروق اعظمؓ جیسا مدبر حکمران، سیاست دان تاریخ کے آئینے میں کہیں نظر نہیں آتا۔ خالد بن ولید، حضرت ابو عبیدہ، حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہم جیسا سپہ سالار ڈھونڈے سے نہیں ملتا۔ بلا شبہ آنحضرت ﷺ کی محبت اور اطاعت نے ان صحابہ کرام کو آنے والی نسلوں کے لیے قابلِ تقلید بنا دیا ہے۔ انہوں نے رسول کی اطاعت کی، ساری دنیا ان کی ہو گئی۔

ہر کہ عشقِ مصطفیٰ سامانِ اوست
بحر و بر در گوشۂ دامانِ اوست

---

120 آل عمران:۳۱

ہماری چند دیگر مطبوعات

دعوۃ اکیڈمی
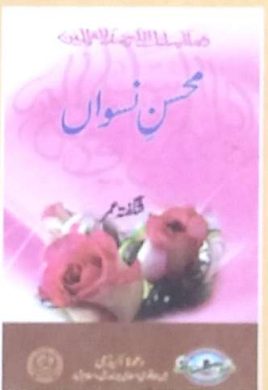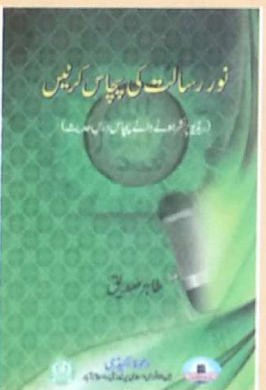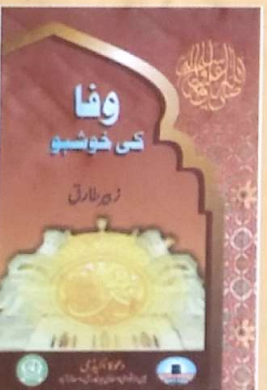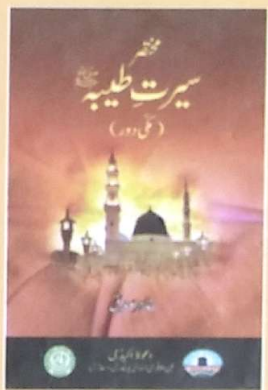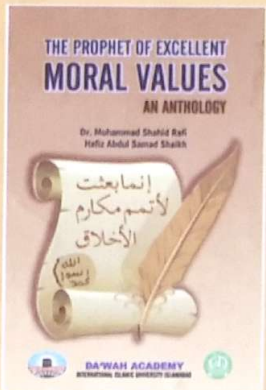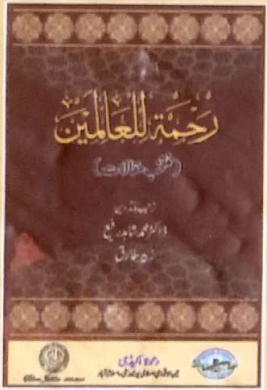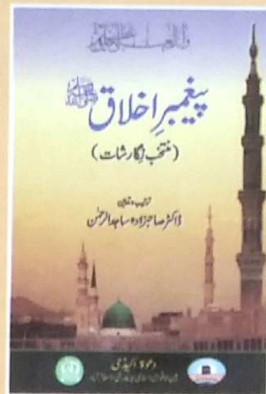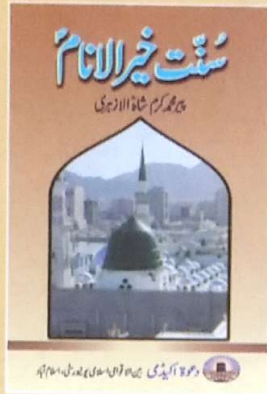
بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی

پوسٹ بکس: 1485 اسلام آباد، پاکستان، فون: 051-9261751،2262031، فیکس: 051-2261648

ای میل: publications.da.iiui@gmail.com